MAHAR M.
MAZHAR KATHIA
Official Chanel
Youtube.com
غیاث چودھری

غیاث چودھری

عارف عبدالمتین اکیڈمی

۱۔ ایبٹ روڈ ۔۵۔ لاہور ۔۶

ضابطہ

اشاعت	:	اوّل
تعداد	:	۱۰۰۰
حقوق	:	بحق مؤلف
ناشر	:	عارف عبدالمتین اکیڈمی
سرِورق	:	سعید اختر
پریس	:	معراج دین پرنٹرز، لاہور
سالِ اشاعت	:	۱۹۹۰ء
قیمت	:	۴۰/- روپے

محترم جناب پروفیسر عارف عبدالمتین صاحب کی ذاتِ گرامی

کی نذر

جنھوں نے میرے گفتار و کردار کی درشتی کو غیر مرئی انداز میں حلاوت و شائستگی

میں بدلنے کا عمل اُسلوبِ دلبری سے جاری رکھا ہُوا ہے

ترا وُہ قول، صحیفہ ہے، حفظِ جاں ہے سب مجھے

"پلا کے سب کو بتائیں گے، وہ لوگ ہم ہو نگے"

غیاث چودھری

مقدمہ

اس کتاب میں جتنے مفکرین اور دانشور حضرات کے اسمائے گرامی درج ہیں۔ میں نے ان سب کی خدمت میں ایک ہی سوال پیش کیا تھا جو کچھ اس طرح سے ہے۔ "سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں کم کیوں ہے جب کہ ہر کوئی سچ ہی کا حامی یا دعویدار ہے"؟ اس سوال کی مزید وضاحت میں نے اس طرح کر دی تھی کہ دنیا میں جتنے بھی مکتبہ ہائے فکر موجود ہیں ان سب کے ہاں سچ جھوٹ، نیکی بدی' اور اچھائی برائی کی اصطلاحیں پائی جاتی ہیں اور ان تمام مکتبہ ہائے فکر کا اپنا اپنا سچ ہے اور ان کا اپنا اپنا جھوٹ ہے لیکن ان سب کے ہاں ان کے اپنے سچ کے مقابلے میں ان کے اپنے ہی جھوٹ کی عملداری زیادہ ہے۔ آخر ایسا کیوں؟ سچ سے میری مراد انسانی معاشرے کی وہ قدر ہے جس کے تحت انسانی زندگی انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر پھلے پھولے اور جھوٹ سے میری مراد اس صورت حال کی ضد ہے لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ کوائف کا گوشوارہ اس سے قطعی مختلف ہے پروفیسر عارف عبدالمتین صاحب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سچ کا دم گھٹتا رہا لوگوں کے سینوں میں سدا ؎
اور چرچا جھوٹ کا ہوتا رہا اخبار سے

میں بھی اسی سچ کا ذکر کرنے جا رہا ہوں جس کا ہمیشہ سے ہی لوگوں کے سینوں میں دم گھٹتا رہا ہے اس شعر کے مطالعہ سے میرے اندر کی ایک استمراری کیفیت کو بہت زیادہ تحریک ملی اور میں نے اس بات پر مسلسل غور کیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ انسان نے زندگی گذارنے کے لیئے جو قوانین بنا رکھے ہیں وہ ان پہ

پوری طرح کاربند نہیں رہتا بلکہ جہاں تک ممکن ہو ان قوانین سے انحراف کرتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں وہ سب اپنے الہامی ہونے کے بھی دعویدار ہیں اور ان تمام مذاہب کے ماننے والے ایسے عقائد بھی رکھتے ہیں جن کے مطابق اگر وہ اپنے اپنے مذہبی قوانین کی پابندی کریں تو نہ صرف ان کی دنیاوی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے بلکہ مابعد الطبیعاتی زندگی بھی کامیاب ہوگی لیکن دیکھا گیا ہے کہ اس آسودگی بخش امکان کے باوجود تمام مذاہب کے ماننے والے اپنے مذہبی قوانین کی پوری طرح پابندی نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس ان قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ بعینہٖ اسٹیٹ کے قواعد وضوابط سے بھی روگردانی کی جاتی ہے لہٰذا میں نے اس موضوع پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ مجھے خیال آیا کہ اس مسئلے پر خود لکھنے سے پہلے کیوں نہ مختلف اہم مفکرین اور دانشور حضرات سے یہ سوال پوچھا جائے شاید کوئی اطمینان بخش حل نکل آئے جس کو کتابی شکل میں خلق خدا کے سامنے پیش کیا جائے۔ لہٰذا میں نے جن دانشور حضرات سے رجوع کیا انہوں نے مجھے بہت پذیرائی بخشی اور میرے سوال کو جیسے جیسے Concieve کیا۔ ویسے ویسے انہوں نے اس سوال کا جواب ارزانی فرمایا جس کے لیئے میں ان تمام کرم فرماؤں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں اور ان کے جوابات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں لیکن میں انسانی زندگی کے جن پہلوؤں پر خود غور کرتا رہا ہوں ان سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کتاب کے مقدمے کی صورت میں کر رہا ہوں۔

فطرت نے انسان کو غور وفکر کی ذہنی صلاحیت عطا کی ہے اور یہی استعداد ائسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ محبت اور نفرت دونوں جبلی جذبے ہیں جو ہر طرح کی مخلوقات میں پائے جاتے ہیں لیکن انسان کی قوتِ گویائی، روحانیات کا شعور اور وسعتِ کائنات کا ادراک یہ ایسے اوصاف ہیں جو کسی اور مخلوق کو ودیعت نہیں ہوئے۔ قطع نظر اس کے کہ انسان ان کے استعمال میں کامیاب ہوا ہے یا ناکام رہا ہے انسانی ذہن نے مابعد الطبیعاتی احوال وکوائف کا ادراک حاصل کرنے کی بھی

کوشش کی ہے جس کو انسانی ذہن کی مافوق الفہم حدود تک رسائی کی کاوشِ جاں کاہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ آج کا مصروف انسان اس موضوع کی طرف اتنی توجہ نہیں دے رہا جتنی توجہ ماضی کے فراغت یافتہ مفکرین نے دی اور اس کے بارے میں لکھا۔ حالانکہ میرے خیال کے مطابق یہ مسئلہ (بعد الموت) آج بھی اتنا ہی حل طلب ہے جتنا کہ اس وقت تھا جب پہلی مرتبہ کسی انسان نے اس کے بارے میں سوچا ہوگا۔

انسان نے یوں تو اپنی ستائش کے بہت سارے معیار متعین کر رکھے ہیں لیکن اس کے بارے میں یہ جو کہا گیا ہے "انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے" انسان کی یہ تعریف اس پر بڑی فٹ بیٹھتی ہے کیونکہ اس کی اب تک کی کارگردگی یہ ہے کہ انسان اپنی ہی نوع کی تباہی اور بربادی پر کمر بستہ نظر آتا ہے جو کہ اس کے ظالم اور جاہل ہونے کا ثبوت ہے آئیے تاریخ آدم کے تناظر میں انسانی زندگی کا مختصر جائزہ لیں اور دیکھیں کہ انسانی ذہن جس نہج پر چلتے ہوئے فروغ پذیر ہوا ہے اگر یہ اسی نہج پر آگے بڑھتا رہا تو کیا مستقبل میں انسانی زندگی کے تحفظ کی ذمہ داری اٹھا سکے گا؟

سائنسی دریافت کے مطابق انسان کرۂ ارض پر پیدا ہونے والی مخلوق کا رکن ہے۔ ایک کہاوت کے مطابق "انسان حیوانِ ناطق ہے" اس کہاوت کو درست مان لیا جائے تو یہ بات خود بخود تسلیم ہو جاتی ہے کہ انسان کرۂ ارض پر پیدا ہونے والی مخلوقات کا رکن تو ہے مگر اس کو باقی مخلوقات پر فضیلت حاصل کرنے کے لیئے لاکھوں سال تک جدوجہد کرنا پڑی۔ علاوہ ازیں انسان کے اندر حیوانی خواص کا پایا جانا بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے اسی حوالے سے بات کو آگے بڑھاتے ہیں اور اس کرۂ ارض کے وجود میں آنے کے بعد اس پر رونما ہونے والے واقعات کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بات کرتے ہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ اس کرۂ ارض کو پیدا ہوئے ساڑھے چار ارب سال یا اس سے بھی زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے جس میں سے وقت کا بہت بڑا حصہ زمین پر

زندگی کے آثار پیدا ہونے سے پہلے ہی گذر چکا تھا۔

سائنسی معلومات کے مطابق جب سے انسان زمین پر آباد ہے یہ عرصہ زمین کی اب تک کی عمر کا چند لمحے بنتا ہے جس کا ہم انسان کے حوالے سے جائزہ لینے جا رہے ہیں لیکن ہیں اس سلسلے میں تاریخی کتب سے حوالے اور اقتباسات پیش نہیں کر دں گا کیونکہ اس صورت میں بات بہت لمبی ہو جائے گی اور ہم اپنے موضوع سے بہت دور چلے جائیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ جب یہ زمین وجود میں آئی تو یہ ایک گیس کا دہکتا ہوا گولہ تھا جس کو ٹھنڈا ہونے میں ایک طویل مدت لگی۔ پھر ایک طویل عرصے بعد زمین کی سطح پر برف کی بہت موٹی چادر جم گئی اور جب سورج کی گرمی سے برف پگھلی تو اس نے پانی کی شکل اختیار کی اور سمندر وجود میں آیا۔ پھر اس پانی میں زندگی کی ابتدا ہوئی اور لاکھوں سال پہلے انسان کی ابتدائی شکل وجود میں آئی تھی۔ کئی ہزار سال قبل مسیح تک کا زمانہ پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے جس کو ماہرین نے کئی مدارج میں تقسیم کر کے بتایا ہے کہ کیسے کیسے حالات اور کیسے کیسے موسموں میں سے گذر کر انسان اس قابل ہوا کہ اس نے دو ٹانگوں پر چلنا شروع کیا اور اشاروں کنایوں سے اپنا مطلب بیان کرنا سیکھا۔ اس وقت کے انسان کو Homo Sapiens کہا گیا ہے جہاں تک انسان کا اپنے خیالات کو تحریری شکل دینے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ماہرین کا خیال ہے کہ وہ اپنے ایجاد کردہ الفاظ کو مختلف اشیاء پر تحریر کرتا چلا آ رہا ہے جن میں پتھر، لکڑی، دھات، جانور کی کھال اور درختوں کے پتے وغیرہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس وقت سے لے کر اب تک یہ جان سکتے ہیں کہ اس عرصے میں انسان نے اپنی زندگی کیسے کیسے طریقوں سے گذاری ہے اور کن خطوط پر چلتے ہوئے انسانی زندگی یہاں تک پہنچی ہے اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انسان زندگی کو برقرار رکھنے کے لیئے لوازمات حیات مہیا کرنے کے علاوہ کن مقاصد کو سب سے زیادہ توجہ دیتا رہا ہے اس سلسلے میں ہمیں تواریخ سے جو شواہد ملتے ہیں ان کے مطابق انسان گروہوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شروع میں

دو گروہ سے بات چلی ہو گی لیکن آج یہ عالم ہے کہ انسانی گروہوں کا شمار کرنا ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ ابتدائے زمانہ ہی سے تمام گروہ کسی نہ کسی بہانے سے، کسی نہ کسی مجبوری کے تحت کسی نہ کسی غلط فہمی کی بنا پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہی رہے ہیں اور انسانی زندگی میں جتنے بھی مختلف مشن ہو سکتے ہیں ان تمام مشنوں پر جنگ و جدل ہی کو فوقیت حاصل رہی ہے۔ یہ جنگ و جدل خواہ دو گروہوں کے درمیان ہو، خواہ دو ملکوں کے درمیان ہو، خواہ دو براعظموں کے درمیان! اگر آپ کو میدانِ جنگ سے کال آ جائے تو پھر آپ چاہے کسی بھی مشن سے متعلق کیوں نہ ہوں آپ پر لازم آتا ہے کہ آپ اپنا سب کچھ تیاگ دیں اور جس حالت میں بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں خود کو میدانِ جنگ میں تصور کریں اور میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے سپاہیوں کا جس صورت میں بھی ساتھ دے سکتے ہیں دیں۔ آپ کو یہ پوچھنے کی اجازت نہیں ہے کہ یہ لڑائی کیوں ہو رہی ہے کوئی بھی یہ سوچنے کی کوشش نہیں کرتا کہ آخر روئے زمین پر ابتدائے زمانہ ہی سے منظم ترین طریقوں سے انسان آپس میں کیوں لڑ لڑ کر مر رہے ہیں۔ تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ انسان نے گویا اپنی زندگی کا حقیقی مشن انسانوں کے درمیان جنگ و جدل جاری رکھنے کو ہی بنا رکھا ہے اور باقی تمام مشنوں کو ثانوی یا اضافی حیثیت دے رکھی ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ انسان نے جس شعبۂ زندگی میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے وہ یہی جنگ و جدل کا شعبہ ہے کیونکہ ابتدا ہی سے انسانی ذہن کا استعمال کچھ اس طرح ہوا ہے کہ ایک طبقہ کس طریقے سے دوسرے طبقے پر حاوی ہو سکتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر آدمی کی فطرت میں، اس کے لاشعور میں، یہ خوف جاگزیں ہو چکا ہے کہ ہر دوسرا آدمی اس کا دشمن ہے اور اگر وہ اسے ختم نہیں کریگا تو دوسرا آدمی اسے ختم کر دیگا۔ اسی خوف کے تحت انسان نے دوسروں سے اختلافات کے اتنے زیادہ بت تراش لیئے ہیں کہ ان سب کو خود اپنے ہاتھوں توڑنا اس کے لیئے ممکن نظر نہیں آتا بلکہ یوں لگتا ہے کہ انسان نے اس مختصر سی زندگی کو انہی بتوں

کی پرستش کے لیئے وقف کر رکھا ہے اور اس عذاب میں زندگی بھر مبتلا رہتا ہے کیونکہ منفی سوچ کے تحت جب وہ دوسروں کے خلاف ایک حربہ استعمال کرتا ہے تو دوسرے وقت میں خود بھی اسی حربے کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے پتھر اٹھایا تو جواباً لاٹھی وجود میں آئی پھر لاٹھی کی جگہ تلوار نے لی تو بندوق پیدا ہو گئی اس کے جواب میں پستول آئی تو اس نے کلاشنکوف کو جنم دیا اور ملکی سطح پر توپ، ٹینک، ایٹم بم، میزائل، لیزر شعاعیں اور کیمیکل وارفیئر کی موجودگی میں یہ کیسے سوچ لیں کہ انسان اپنی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے انسان تو اپنے خاتمے کی آخری سیڑھی پر کھڑا ہے جب انسان کی فطرت میں یہ خوف موجود ہے کہ دوسرا (یا جس کو وہ اپنا مدمقابل خیال کرتا ہے) اس کو ختم کر دے گا تو ایسی صورت میں وہ اپنے بنائے ہوئے بٹن کو کسی بھی وقت دبا کر اپنے سپریم پاور ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے لیکن سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ بٹن کا دبایا جانا کوئی معمولی سا فعل تو نہیں ہے یہ تو سب کی تباہی کا باعث ہوگا مطلب یہ ہے کہ روئے زمین پر ہر طرح کی زندگی کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے ورنہ اس کائنات میں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ کائنات کے حوالے سے اس PHENOMINA میں انسان کی حیثیت تو ایک MICRON کے برابر بھی نہیں ہے لیکن انسانی زندگی جس پراسیس میں سے گذر کر یہاں تک پہنچی ہے اس کی وجہ سے اس چھوٹی سی مخلوق کی اہمیت بہت ہے اسے ختم نہیں ہونا چاہیئے۔

اجتماعی طور پر انسان آج جس قدر ذہین اور فہم و ادراک کا حامل ہے۔ پہلے زمانوں میں نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پاس اتنے وسائل زندگی تھے جتنے آج اس کی دسترس میں ہیں۔ پہلے وقتوں میں عام لوگ بھیڑ بکریوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے اور ذہین لوگوں کی معمولی سی تعداد عام لوگوں کو جیسے چاہتی استعمال کرتی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جہاں انسانی معاشرے کا منتظم طبقہ مزید سوجھ بوجھ کا مالک ہوا ہے وہاں عام آدمی بھی توہم پرستی کے طویل دور سے نکل کر یہ سوچنے

لگتا ہے کہ اس خوبصورت دنیا میں وہ بھی مراعات یافتہ طبقے کے افراد کی طرح زندگی کی آسائشوں کے حوالے سے برابر کا شریک کیوں نہیں ہے۔ پہلے وقتوں میں عام آدمی کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ زندگی کی تمام سہولتیں اور عیش و آرام صرف حکمران طبقوں اور آقاؤں وغیرہ کے لیئے ہی مخصوص ہوتے ہیں انہیں یہ بھی باور کروایا گیا کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے اور دیوتاؤں کی جانب سے ہوتا ہے اور عام آدمی صرف حکمران طبقے کے تابع رہ کر ہی زندگی گذار سکتا ہے بلکہ ماضی کے عوام نے تو اپنی جہالت کے تحت اس بات کو اپنا جزوِ ایمان بنا رکھا تھا کہ وہ صرف غلامانہ زندگی گذارنے کے لیئے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے ابھی تک بعض علاقوں میں اندھی پیری مریدی، آقا اور غلام کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ویسے اب لوگوں کی بڑی تعداد یہ جانتی تو ہے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے لیکن وہ معاشی طور پر ایسے حالات میں گھرے ہوئے ہیں کہ اپنے اوپر ظلم اور زیادتی برداشت کرنے پر مجبور ہیں اور جب کبھی ان کو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے اظہار کا موقعہ ملتا ہے تو غاصبوں کی طرف سے یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ کچھ شرپسندوں نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی ہے حالانکہ درحقیقت ایسی کوئی صورت حال نہیں ہوتی بلکہ اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ غلط سوچ رکھنے والوں اور کالے دھندے کرنے والوں کو انسانی معاشرہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ جہاں وہ یہ تمام غلط کاریاں کرتے ہیں وہاں اپنے کرتوتوں کی سزا بے گناہ افراد کو دلوانے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسی اندوہناک صورتِ حال میں لازماً کہیں نہ کہیں تو لاوا پھوٹ ہی پڑتا ہے۔ پتھر کے زمانے سے لے کر موجود زمانے تک ذہین اور کائیاں ذہنیت رکھنے والا طبقہ دوسروں کی کمائی کھانے والا طبقہ اب بھی اپنی پرانی ڈگر کو نئے ہتھکنڈوں کے ساتھ قائم رکھنے میں سرگرم عمل ہے لیکن اب عام آدمی کا یہ عقیدہ کافور ہو چکا ہے کہ متمول طبقہ اپنے اچھے مقدر خدا کی طرف سے لے

کرآتا ہے اب ہر آدمی یہ بہر طور قیاس کرنے لگا ہے کہ اس خوبصورت اور حسین وجمیل زندگی میں اس کا بھی برابر کا حصہ ہے جس طرح پہلے وقتوں میں امراء کا طبقہ عیش و آرام کی زندگی گذارتا تھا اور اس طبقے کے کتوں کو جو سہولتیں حاصل تھیں اس وقت کے عام آدمی کو حاصل نہیں تھیں اور آج بھی ایسا ہی ہے فرق صرف یہ پڑا ہے کہ گذشتہ زمانے کا عام آدمی اس ظالمانہ روش کو تقدیر کا لکھا جان کر برداشت کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ جب کہ آج کا عام آدمی اس ظلم کو نہ صرف ظلم سمجھنے لگا ہے بلکہ اس جبر واستحصال کے خلاف احتجاج بھی کرنے لگا ہے اور نتیجہ کے طور پر استحصالی طبقہ اپنا وہ وقار کھو چکا ہے جو اسے ماضی کے عام آدمی کی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے حاصل تھا اب یہ طبقہ بوکھلاہٹ میں آکر طاقت کے استعمال سے عام لوگوں کو پریشان تو کر سکتا ہے لیکن دنیا میں امن کی فضا بحال نہیں کر سکتا کیونکہ امن کی فضا پیدا کرنا اور اسے برقرار رکھنا کسی بھی طبقے کی انتظامیہ کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس مہم کی کامیابی کے لیئے انتظامیہ کے تمام اہم افراد کو اپنی تمام غلط کاریاں ترک کرنا پڑتی ہیں جو کہ ان کے لیئے ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کی نشوونما ہی اس طرح سے ہوئی ہے کہ کسی بھی طبقہ کی انتظامیہ کے افراد اپنے حقوق سے تجاوز کرنا اپنا حق اور دوسروں کو ایسا کرنے پر سزا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ماضی میں انسان نے اپنے ہم شکل کروڑوں انسانوں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو اس نے اپنے جانوروں کے ساتھ روا رکھا، وہی کام انسانوں سے بھی لیا جو جانوروں سے لیا تھا جس طرح گھوڑوں، ہاتھیوں، بیلوں اور کتوں کو سلطنتوں کی وسعت کے جنون میں جنگ کی آگ میں جھونک دیا اسی طرح لاکھوں انسانوں کو بھی آپس میں لڑا کر موت کے گھاٹ اتار دینے سے دریغ نہ کیا اور انسانی خون کی ندیاں بہا کر اپنے چند حواریوں کے ساتھ جشن منائے اس کام میں بڑے بڑے فلاسفر صاحبانِ عقل و دانش اور بڑے بڑے سخنوروں نے ان ظالموں کا ساتھ دیا

اور انعام و اکرام سے اپنی جھولیاں بھریں اس بات سے کون انکار کرے گا کہ دنیا کے ہر ملک میں صاحبانِ عقل و دانش موجود ہیں۔ اور انسان نے یا انسانوں نے انسانوں کا جو قتل عام اور استحصال شروع کر رکھا ہے اس ظالمانہ کاروبار میں چوٹی کا دماغ رکھنے والے علم و آگہی کے حامل حضرات بھی اور تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد بھی شامل ہوتے ہیں یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ جب دو ملکوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے تو دونوں طرف لوگ شہید ہوتے ہیں، دونوں طرف لوگ غازی بنتے ہیں اور دونوں طرف ملک و قوم کی عزت و حرمت پر جوانیاں نچھاور کی جاتی ہیں۔ دونوں طرف بیواؤں کی آہ و بکا سنائی دیتی ہے اور دونوں طرف بچے یتیم ہوتے ہیں دونوں طرف معبدوں میں مالک کون و مکاں سے اپنی اپنی کامیابی کے لیئے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ کسی طرف سے کوئی ایسی مخلوق دار دہو جائے جو انسانوں کو مار مٹانا چاہے یا نوع انسانی کو اپنا ماتحت بنا کر اس پر حکومت کرنا چاہے تو یقیناً انسان اپنے بچاؤ کے لیئے آخری دم تک اس سے لڑے گا کیونکہ یہ اس کی بقا کا مسئلہ ہے۔ لیکن اگر یہی رویہ انسان خود انسانوں کے خلاف روا رکھے ہوئے ہے تو آپ ہی بتائیں کہ آخر یہ جنگ و جدل کس کی بقا کے لیئے جاری ہے یہ سب کچھ دیکھ کر میں دنیا والوں سے سوال کرتا ہوں کہ "کیا ابتدائے زمانہ سے لے کر اب تک انسانی ذہن کی جو فروغ پذیری Development ہوئی ہے اسے اس کی ذہنی نشوونما کا صحیح راستہ قرار دیا جا سکتا ہے"؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر واویلا کرنے والی کوئی بات نہیں لیکن اگر جواب نفی میں ہے تو میرا یہ گمان حقیقت پر مبنی لگتا ہے کہ انسانی ذہن کی فروغ پذیری اس نہج پر نہیں ہو رہی جس نہج پر چل کر ہونی چاہئے تھی کیونکہ دنیا میں جتنے بھی مکتبہ ہائے فکر موجود ہیں ان سب کے اپنے اپنے سچ اور اپنے اپنے جھوٹ متعین صورت میں موجود ہیں۔ لیکن ان تمام طبقوں میں سے کوئی بھی اپنے ہی بنائے ہوئے سچ پر کاربند نظر نہیں آتا جس سے یہ منطق وجود میں آتی ہے کہ انسانی ذہن کے سوچنے کی سمت ہی درست نہیں ہے

یعنی انسان اس کائنات کو اس زندگی کو اس خدائی کو کسی اوزار وئیے سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ انسانی ذہن جس نہج پر فروغ پذیر ہو رہا ہے وہ اس لیئے درست نہیں ہے کہ جب انسان نے پتھر کے ٹکڑوں کو جانوروں کا شکار کرنے کے لیئے اوزاروں کے طور پر استعمال کیا تھا تو وہ وقت اس کی ذہنی سوچ کی ابتدا کا زمانہ تھا جوں جوں انسان کا ذہن بڑھتا گیا یہ اپنے اوزاروں کو بھی مزید بہتر شکل فراہم کرتا رہا۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے پاس بہت بڑی تعداد میں تباہ کن ہتھیار موجود ہیں جن سے روئے زمین پر پوری کی پوری زندگی کو لمحوں میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں تو اس نے اپنی خوراک پیدا کرنے کے لیئے پتھر اٹھایا اور جانور کا شکار کیا لیکن آج یہ اپنے خطرناک ترین سامانِ حرب کو خود اپنی ہی نوع کے خلاف استعمال کر رہا ہے کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ انسان کے ذہن میں کوئی ایسا اجنبی عنصر ہے جو اسے ہمیشہ ہی سے غلط راستے پر لے جا رہا ہے اور جس کی بیخ کنی انسان کی بہتر زندگی کے لیئے ناگزیر ہے؟

OOO

انسانی برادری میں کچھ بڑے بڑے طبقات ہیں جیسے دانشور طبقہ، سیاست دان طبقہ، سائینسدان طبقہ، اور قانون دان طبقہ اور بھی بہت سارے طبقات ہیں لیکن مثال کے طور پر پیش کرنے کے لیئے یہ چار طبقے ہی کافی ہیں کیونکہ انسانی سوسائٹی کی باگ ڈور ان ہی چاروں طبقوں کے ہاتھوں میں رہی ہے اور ان چاروں طبقوں کے ربط و تعاون ہی سے کاروبارِ حیات چلتا رہا ہے میں اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان چاروں طبقات کے اربابِ بست و کشاد جغرافیائی اعتبار سے تو مردہ گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کئی علاقوں میں جغرافیائی اعتبار کے خلاف بھی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں کیونکہ پہلے تو کرۂ ارض کے حصے بخرے جغرافیائی اعتبار سے ہوئے اور بعد میں دوسری بنیادوں پر زمین کی تقسیم کی جاتی رہی ہے جب کہ زمین کی تقسیم یا اس کے حصے بخرے اس خیال سے کرنا کہ ایسا کرنے سے دنیا میں امن قائم ہو جائے گا قرین قیاس نہیں ہے بلکہ روئے زمین کے جس قدر زیادہ

حصے یا زیادہ ملک بنائے جائیں گے اسی قدر دنیا میں زیادہ افراتفری، بے چینی بے اعتمادی اور لاقانونیت بڑھے گی۔ موجودہ صورت حال کے مطابق مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے بااختیار لوگ دنیا کے تمام ممالک میں موجود ہیں آپ ان کے کسی بھی گروہ کے افراد سے بات کر کے دیکھیں تو وہ آپ کو یہی تاثر دیں گے۔ کہ وہ سب نوعِ انسان کی بھلائی اور فلاح و بہبود ہی کے لیئے کام کر رہے ہیں لیکن جب آپ ان بااختیار لوگوں کے عملی رویوں کا جائزہ اُن کے ارشادات و تحریرات کے حوالے سے لیں گے تو آپ اس نتیجے پہ پہنچیں گے کہ ان کے اقوال اُن کے افعال پر منطبق نہیں ہوتے۔ میرے نزدیک اس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ دنیا کے تمام ممالک میں کام کرنے والے دانشور، سیاست دان، سائینسدان، فلسفہ دان اور قانون دان حضرات اپنے اپنے ممالک میں مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتے بلکہ یوں لگتا ہے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ کنٹریکٹ basis پر کام کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ جب کوئی آدمی کسی فرم یا ملک کا کنٹریکٹ سائین کرتا ہے تو اسے اس فرم یا ملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں انسانی معاشرے میں جو بڑے بڑے بااختیار طبقے ہیں ان کے تمام افراد اپنے اپنے ممالک میں کنٹریکٹ basis پر ہی کام کرتے ہیں اور وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے انسانی سوسائٹی کے تمام افراد اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ جہاں ہر شخص کنٹریکٹ basis پر کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ انسانی سوسائٹی میں جو رویّہ غالب صورت میں نظر آتا ہے وہ ہے نظریۂ مفاد کا رویّہ۔ موجودہ صورت حال میں سچ کا رویہ اور جھوٹ کا رویہ، یہ دونوں رویئے اپنی اپنی اہمیت کھو رہے ہیں اور ان کی جگہ تیسرا رویّہ پر کر رہا ہے جو کہ نظریۂ مفاد کا رویّہ ہے۔ لوگوں کی اکثریت کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے اس بات پر غور کرتی ہے کہ اس کام کو کرنے کی صورت میں کیا فائدہ ہو گا۔ اس کام کو عذاب یا ثواب، سچ یا جھوٹ، نیکی یا بدی اور غلط یا صحیح کے حوالے سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس حوالے سے دیکھا جاتا ہے کہ اس کام کی انجام دہی میں کوئی فائدہ

مضمر ہے یا نہیں۔ اسی رویئے نے نظریۂ مفاد کو جنم دیا ہے۔

میں نے جن چار طبقوں کا ذکر مثال کے طور پر کیا ہے کہ ان طبقات کے افراد کنٹریکٹ basis پر کام کرتے ہیں ان کے کنٹریکٹ basis کی تشریح کچھ اس طرح ہے کہ وہ لوگ ایک طرف تو حکومت وقت کو اپنے وفادار ہونے کا ثبوت مہیا کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے اپنے شعبوں میں رہتے ہوئے دوسرے شعبوں کے افراد بالا سے ضروریاتِ زندگی کے حصول میں ایک دوسرے سے پورا پورا تعاون کرتے ہیں اور اس تعاون میں جو گھپلے ہوتے ہیں وہی گھپلے انسانی سوسائٹی میں افراتفری کا باعث بنتے ہیں جن کا ہم سب شکار ہیں تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے یہ ذہین اور اعلیٰ تعلیمیافتہ لوگ جن کو معاشرے کی کریم ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے اپنے علاوہ باقی مخلوق خدا کو آج بھی بھیڑ بکریاں ہی تصور کرتے ہیں ان طبقات کی ذہنی نشوونما ایسے مکتبۂ فکر میں کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیئے استحصالی طریقِ کار کو ہی درست خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا اس طریقِ کار کو صحیح سمجھنا بذاتِ خود غلط ہے یہ راستہ تو ہر صورت انسانی سوچ کو پستی کی طرف لے جا رہا ہے لیکن چونکہ استحصالی طبقے نے ڈارون کے نظریئے کو ہی اپنی بقا کا راستہ تصور کر لیا ہے کہ "طاقت کا استعمال اور کمزوروں کا استحصال فطرت کے عین مطابق ہے" اس لیئے یہ طبقہ تاریخ کا مطالعہ اسی نظریئے کی روشنی میں ہی کرتا ہے کہ ماضی میں کس جابر نے سب سے زیادہ کامیاب عہدِ حکومت گذارا۔ چاہے اس کے دور میں لاکھوں جانیں جنگ کی بھٹی میں جھونک دی گئی ہوں کیونکہ ان کی صوابدید میں لاکھوں انسانوں کو فوج کی صورت میں غلام بنا کر رکھنے اور ایک ہی اشارے پر سب کو موت کے گھاٹ اتروا دینے میں کوئی مذائقہ نہیں ہے۔

ان تمام مذکورہ بالا معروضات کی روشنی میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسانی فکر کی نہج سراسر غلط رہی ہے جس کو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ صحیح تصور کر لیا گیا ہے اور اس نامطلوب صورت حال کی وجہ سے انسانی معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں انہیں دور کرنے کے لیئے بڑے بڑے عالم فاضل اور صاحبان عقل و دانش سے بین الاقوامی سطح پر کئی کئی روز کے دورانیئے پر مشتمل سیمینار منعقد کرواتے ہیں جن میں کئی

کئی قرار دادیں منظور کی جاتی ہیں ذرائع ابلاغ کی طرف سے لمبے چوڑے تبصرے ہوتے ہیں اخبارات کئی کئی کالموں پر مشتمل سرخیاں جماتے ہیں اور زبانی زبانی بہت زیادہ واویلا کیا جاتا ہے لیکن عملی طور پر صورتِ حال جوں کی توں ہی رہتی ہے یعنی انسانی قتل و غارت جاری رہتی ہے۔

اب تک کی گفتگو کے حوالے سے ایک وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس طرح سے ہے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ تمام دنیا کے مکتبہ ہائے فکر شعوری طور پر ایسا کرتے ہیں بلکہ اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ یہ عمل لاشعوری طور پر انجام پذیر ہوتا رہا ہے لیکن بہر حال یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اس شعوری اور لاشعوری کاروائی سے انسانی معاشرے کو مسلسل نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لہٰذا انسانی سوسائٹی کی احسن فروغ پذیری کے لیئے اس میں تبدیلی کو روا رکھنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی معاشرے میں جو بھی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں یا پہلے سے موجود ہیں ان کے بارے میں سوچنا، غور کرنا اور انہیں دور کرنا بھی انسان ہی کا کام ہے اس سلسلے میں کوئی اور نوعِ انسان کا ہاتھ نہیں بٹا سکتی دوسرے لفظوں میں اس زمین پر ایک لاکھ سے بھی زیادہ قسم کی مخلوق موجود ہے جس کی وجہ سے زندگی کو مشکلات درپیش ہیں۔ انسانوں کے خود پیدا کردہ مصائب بھی ہیں۔ ان سب کا باریک مشاہدہ اور ان کی بیخ کنی بھی انسان ہی کی ذمہ داری ہے اس لیئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انسان خود اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں کوئی حکم تو صادر نہیں کیا جا سکتا البتہ کچھ تجاویز زیر بحث لائی جا سکتی ہیں کیونکہ انسانی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انہیں زیر بحث لایا جائے۔ ان پر غور و فکر کر کے ان کا حل تلاش کیا جائے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ان وجوہات کا ذکر کیا جائے جو میرے نزدیک انسانی سوچ کی غلط سمجھ کا باعث ہو سکتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کچھ خصوصیات انسانی زندگی میں اس طرح در آئی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ انسانی فطرت کا ایسا حصہ بن کر رہ گئی ہیں جس کے تحت انسان کائنات کو اپنے مضافات سمیت

جس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے وہ بذاتِ خود اس کی کج بینی پر دلالت کرتا ہے اور اس کی اصلاح انسانی بقا کے لیئے ناگزیر ہے

(۱) انسان انفرادی طور پر خود کو بہت زیادہ اہمیّت دیتا ہے۔

اس خصوصیت کے تحت وہ خود کو دوسروں سے برتر اور ارفع ہونے کے زعم میں مبتلا کر لیتا ہے۔ دراصل انسانی زندگی کے ارتقائی عمل کو جاری رکھنے کے لیئے زندگی کے تمام فنون کے تحت تزئین ذات نہایت ضروری ہے جب کہ تشہیر ذات کا عمل ارتقائے حیات کی نفی کرتا ہے اس خصوصیت کو شعور اور لاشعور سے نکال باہر کرنا ہی انسانی ذہن کی نہج کو درست کرنے کے مترادف ہے۔

(۲) انسان انفرادی طور پر خود کو غیر محفوظ تصور کرتا ہے۔

وہ اس علت کے تحت اپنی تمام زندگی اپنے تحفظ کا سامان فراہم کرتے کرتے ہی گذار دیتا ہے حالانکہ انسانی زندگی کا اجتماعی تحفظ ہی انفرادی سلامتی کی گارنٹی مہیا کر سکتا ہے اس بات کو دل سے قبول کر لینے ہی سے انسانی ذہن کا قبلہ درست ہو سکتا ہے

(۳) انسان حدِ ملکیّت کو غیر محدود رکھنا چاہتا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان ننگا پیدا ہوتا ہے اور ننگا ہی اس دنیا سے واپس چلا جاتا ہے ہر چند کہ احتراماً اس کے جسدِ خاکی کو کپڑے میں لپیٹ دیا جاتا ہے تاہم وہ دنیا میں آکر یہاں کی ہر چیز کو اپنی ملکیت میں لے لینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سراسر غلط اور گمراہ کن سوچ کا نتیجہ ہے جس نے اسے انسانی رفعت سے گرا کر بھیانک نشیب میں اتار دیا ہے۔ خالی ہاتھ پیدا ہونے والے انسان کے لیئے ضروری ہے کہ وہ ہوس زر کا شکار نہ ہو بلکہ انفاق کا راستہ اختیار کرے۔ کیونکہ ارتکازِ زر سے گریز کرتے ہوئے انفاق کے راستے پر چلنا ہی انسانی فکر و عمل کی صحت کا سامان فراہم کر سکتا ہے۔

(۴) انسان موت سے بہت زیادہ خوفزدہ ہے۔

اس حد سے بڑھے ہوئے خوفِ مرگ نے انسان کو ہر زمانے میں کا شکار بنائے رکھا ہے جس کی وجہ سے اس نے بہت سے تعمیری کاموں میں نہ صرف رکاوٹیں ڈالیں بلکہ کئی صورتوں میں ہر طرح کی تعمیری کارکردگی کو آگے بڑھنے سے مکمل طور پر روکے رکھا۔ لیکن موت نے تو آنا ہی ہوتا ہے۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ البتہ اسے انسانی رفعتوں اور عظمتوں سے معنوی طور پر لافانی ضرور بنایا جا سکتا ہے اور یہی راست عمل انسان کے رویئے کو سابقہ کج روی سے محفوظ کرنے کا ضامن بن سکتا ہے۔

(۵) انسانی زندگی پر جھوٹی اقدار کو فوقیت حاصل رہی ہے۔

جنہوں نے انسان کے حقیقی قد کو بڑھانے کی بجائے گھٹا دیا ہے کیونکہ اس نے من گھڑت باتوں کو ازلی و ابدی صداقتیں بنا کر پیش کرنے کے نامسعود رویئے اختیار کیئے اور کروڑوں انسانی جانیں ان جھوٹی اور خود ساختہ اقدار کی بھینٹ چڑھا دیں۔ لہٰذا انسانی برادری کو نقصان پہنچانے والی اقدار کو ترک کرنا اور مفید اقدار کو اپنانا ہی انسانی روش کو صحتمندی سے ہمکنار کرنے کا موجب بن سکتا ہے۔

میری اس گفتگو کا فکری اجمال یہ ہے کہ جب انسانی برادری وحدتِ انفرادی کی بجائے وحدتِ نوعی کے حوالے سے اپنی کارکردگی کا رخ متعین کرے گی تو اسی تقلیب میں اس کی ابدی فلاح کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

غیاث چودھری

محترم احمد ندیم قاسمی صاحب

جناب عالی: آپ ایک ایسی ہمہ جہت اور قد آور شخصیت کے مالک ہیں جس نے بیک وقت ہماری شاعری، ہماری Fiction، ہماری ثقافت اور ہماری ادارت کو بھرپور انداز سے نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ ان کی قابل قدر انداز میں رہنمائی بھی کی ہے۔ اس ہمہ گیر رہنمائی نے آپ کو جس منفرد، قابلِ رشک اور ارفع مقام پر فائز کیا ہے آپ بجا طور پر اس کے مستحق ہیں۔ کیونکہ اس کے لیئے آپ نے فن کی سطح پر بھی زبردست ریاض کیا ہے اور سماجی سطح پر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ آپ سے کسبِ فیض کرنے والوں کی کثیر تعداد آپ کی فاضلانہ مہارت اور فیاضیٔ طبع کی مظہر ہے میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے طویل عمرانی اور فنی تجادلے کی روشنی میں میرے سوال کا جواب مرحمت فرمائیں گے تاکہ ہم اس حوالے سے بھی آپ کی قیمتی اور رہنمایانہ رائے سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

غیاث چودھری

میرے اندازے کے مطابق جب نوعِ انسانی اپنے ابتدائی مراحل سے گذر رہی ہو گی تو کسی کو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی ہو گی۔ لوگ جھوٹ کے نام سے بھی ناواقف ہوں گے اور سچ اور صرف سچ بولتے ہوں گے۔ جھوٹ کا آغاز تب ہوا ہو گا جب ایک انسان کو دوسرے انسان کے حقوق غصب کرنے کی سوجھی ہو گی اور ظاہر ہے کہ کسی لالچ یا ترغیب کی وجہ سے اسے سچ سے دست کش ہونا پڑے گا۔ لالچ اور ترغیب کا سوال احساس ملکیت سے

پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان بعض املاک کو اپنے تصرف میں لاتا ہوگا تو جھوٹ کا سہارا لیتا ہوگا اور سچ کو روند ڈالتا ہوگا۔ بعد میں ملکیت کے اس جنون نے پورے عالم انسانیت کو اپنی آسیبی گرفت میں لے لیا۔ اس جنون نے طبقے پیدا کیے۔ اس جنون نے ایک دوسرے کے گھروں اور ملکیتوں پر حملہ آور ہونے کے بعد ایک دوسرے کے ملکوں پر یلغار کی اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کے خون سے ہماری زمین ہر دور میں لالہ زار ہوتی رہی۔ انبیاء اس جھوٹ کی کارفرمائی کو ختم کرنے کے لیئے اور سچ یعنی عدل کا علم بلند کرنے کے لیئے ہر ملک اور ہر زمانے میں انسانی گروہوں کو سچ کی تلقین کرتے رہے مگر لوگ محض وقتی طور پر متاثر ہوئے اور معمولی وقفے کے بعد سچ پر جھوٹ غالب آگیا۔ سیاست نے بھی دروغ مصلحت آمیز سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا مگر پھر یہ دروغ سیاست کا محور بن کر رہ گیا۔ سچے سیاست دان بھی آئے مگر دروغ گو سیاست دانوں نے ——— اور وہ بھی اس جنون ملکیت کے تحت ——— سچ کو پوری طرح کبھی ابھرنے نہ دیا۔ آج کی عالمی سیاست گواہ ہے کہ وہ سب جو "بڑے" کہلاتے ہیں کتنی بے حیائی سے سچ کا لبادہ اوڑھ کر بین القومی پلیٹ فارم پر بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں اسی لیئے کم ہے رہی یہ بات کہ اس صورت حال میں ہر کوئی سچ ہی کا حامی یا دعویدار کیوں ہے تو بات یہ ہے کہ جھوٹ بولنے والے بھی جانتے ہیں کہ جھوٹ ایک لعنت ہے ایک اخلاقی پستی ہے ایک انسانیت کش رویہ ہے۔ اگرچہ جھوٹ صدیوں سے بولا جا رہا ہے مگر آج تک جھوٹ کو تقدیس کا درجہ نہیں ملا۔ تقدیس صرف سچ کو حاصل رہی ہے اور اسی لیئے سب لوگ سچ ہی کے دعویدار ہوتے ہیں۔ رہی سچ کی حمایت تو عرض یہ ہے کہ سچ کا دعویدار تو جھوٹا بھی ہو سکتا ہے لیکن جب کوئی شخص سچ کی علی الاعلان حمایت کرتا ہے تو وہ ایک نیک کام کر رہا ہوتا ہے۔ انہی سچوں اور سچ کی حمایت کرنے والوں ہی کے دم سے آج سچ کی تھوڑی بہت آبرو باقی ہے۔

احمد ندیم قاسمی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

جناب عالی! آپ ہمارے ان چیدہ مذہبی علماء اور رہنماؤں میں سے ایک ہیں جو جرئتِ خیال و خیال کے حوالے سے منفرد ہیں اور جن کی آراء سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر ان کی فکری استقامت جرأت اظہار، بیباکی گفتار اور بےخوفی کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا آپ نے قرآن و حدیث کا غیر معمولی وسعت کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور ان کے علمی اطلاقات کی تمام تر نزاکتوں پر آپ کی نظر ہے۔ آپ لوگوں کو ہم خیال بنانے کی غیر معمولی قوت رکھتے ہیں۔ تنظیم اسلامی آپ کی اس قوت جلیلہ کا ایک نمایاں مظہر ہے آپ نے دین کے تقاضوں کی تکمیل و تنقید کے سلسلے میں عصری ضرورتوں کی اہمیت کے حوالے سے بہت تدبّر فرمایا ہے۔ یوں ایک مخصوص نوع کے اجتہاد کا در وا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا میں آرزومند ہوں کہ آپ میرے سوال کے جامع جواب سے ان تمام لوگوں کو اپنے منفرد خیالات سے مستفیض فرمائیں گے جو میری طرح اسکے ہمہ جہت جواب کے لیئے بے تاب ہیں۔

غیاث چودھری

محترمی و مکرّمی غیاث چودھری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے میرے بارے میں جن نیک خیالات و جذبات کا اظہار فرمایا ہے اگرچہ وہ زیادہ تر تو آپ کے حسنِ ظن ہی کا مظہر ہیں اس لیئے کہ "من آنم کہ من دانم" کے مصداق اپنی اصل حیثیت سے میں خود ہی واقف ہوں، تاہم آپ کے اس حسن ظن پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ کا سوال دو[۲] مشاہدات (observation) پر مبنی ہے یعنی:

ایک[۱] یہ کہ دنیا میں سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں کم ہے، اور

دوسرے[۲] یہ کہ ہر انسان سچائی کا حامی یا دعویدار ہے!

میرے نزدیک آپ کے یہ دونوں مشاہدات درست اور مطابق واقعہ بھی ہیں اور مطابق وحئ الٰہی بھی ——— چنانچہ:

۱۔ سورۂ سبا کی آیت ۱۳ میں فرمایا گیا: "وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ" یعنی "میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہیں"۔ اسی طرح سورۂ صٓ کی آیت ۲۴ میں فرمایا۔ "اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ" یعنی "ایمان سے بہرہ مند اور اچھے عمل کرنے والے لوگ کم ہی ہیں"۔ اسی طرح سورۂ انعام کی آیت ۱۱۶ میں فرمایا گیا: "وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" یعنی "اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کے (سیدھے) راستے سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے" ——— مزید برآں بارہ مرتبہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: "وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ" یعنی "لیکن لوگوں کی اکثریت علم (صحیح) سے عاری ہے"؛ اور متعدد بار فرمایا گیا۔ "وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ" یعنی "لوگوں کی اکثریت جذبۂ شکر سے محروم ہے"۔ وَقِسْ عَلٰى ذٰلِكَ۔

۲۔ اسی طرح قرآن اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ اس میں اللہ نے اپنی روح میں سے پھونکا ہے چنانچہ سورۂ حجر اور سورۂ صٓ دو مقامات پر فرمایا گیا: "وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ" ——— انسان میں نفخ شدہ اس روح ربانی کا اثر یہ ہے کہ فطرت انسانی حق اور خیر، بھلائی اور نیکی اور صداقت و امانت کو پسند کرتی ہے اور جھوٹ اور باطل اور شر اور ظلم کو ناپسند کرتی ہے ——— اس حقیقت واقعی پر سب سے بڑا گواہ تو ہر انسان کا اپنا ذاتی ضمیر یا نفسِ لوامہ (یعنی conseience) یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں سورۂ قیامہ کی دوسری آیت میں اس کی قسم کھائی گئی ہے یعنی "وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ" ——— اس کے علاوہ یہ بھی ایک مسلّمہ

حقیقت ہے کہ انسان اپنے گناہ کو چھپاتا ہے اور نہیں چاہتا کہ اس کی خبر دوسرے انسانوں کو ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کا اجتماعی ضمیر بھی جھوٹ اور ظلم سے نفرت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں بدی کی (Definition) ہی یہ کی گئی ہے کہ: "الاثم ما حاک فی صدرک وکرھت ان یطّلع علیہ النّاس" یعنی "گناہ وہ ہے جس سے تمہارے اپنے سینے میں بھی خلجان پیدا ہو جائے اور تم اسے ناپسند کرو کہ لوگ اس سے واقف ہوں"۔

مزید برآں اسی حقیقت کو قرآن اس طرح بھی واضح کرتا ہے کہ اس نے نیکی کے لیے "معروف" اور بدی کے لیئے "منکر" کے الفاظ کو بطور اصلاح اختیار کیا ہے۔ یعنی نیکی فطرتِ انسانی کی جانی پہچانی شے ہے، اور بدی اسے ناپسند ہے!

اب آئیے آپ کے سوال کی جانب، یعنی یہ کہ جب حق و صداقت فطرت انسانی کو اتنے پسند ہیں تو پھر دنیا میں غلبہ ظلم و زور کو کیوں حاصل ہے؟ — تو اس امر واقعی کے دو[۲] اسباب ہیں۔

۱۔ ایک یہ انسان میں صرف روحِ ملکوتی ہی نہیں ہے اس کا نفسِ حیوانی بھی ہے جو صرف اپنی حیوانی جبلتوں کی تسکین سے دلچسپی رکھتا ہے اور جس میں ایک شدید رجحان بدی اور پستی کی جانب موجود ہے، بفحوائے الفاظ قرآنی: "اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ" (سورۂ یوسف آیت ۵۳) انسان کی روحِ ملکوتی کے پاؤں پستی کی جانب کھینچنے والی ان بھاری بیڑیوں ہی کی جانب اشارہ ہے سورۃ التین کی ان آیات میں کہ: "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ" یعنی "ہم نے انسان کو پیدا تو کیا تھا بہترین ساخت پر، لیکن پھر اسے گرا دیا نیچے والوں میں سب سے نیچے"! — چنانچہ انسان کی حیاتِ دنیوی کی توجیہہ ہی از روئے قرآن یہ ہے کہ یہ ایک امتحانی وقفہ ہے، بفحوائے الفاظ قرآنی: "اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا"، یعنی "جس نے تخلیق فرمایا موت اور زندگی کو تاکہ تمہیں جانچے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا"، جس کی صحیح ترین تعبیر کی ہے علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کہ ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب　　　اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

۲- دوسرے یہ کہ اس مادّی دنیا میں جہاں قانونِ طبعی پوری طرح نافذ ہے۔ قانونِ اخلاق نافذ العمل نہیں ہے گویا یہاں طبعی اسباب وعلل کے نتائج وعواقب تو بہ تمام وکمال ظاہر ہوتے ہیں۔ اخلاقی اعمال کے اثرات یا تو بالکل ظاہر ہی نہیں ہوتے، یا ہوتے ہیں تو بہت محدود پیمانے پر، بلکہ بسا اوقات تو یہ بھی ہوتا ہے کہ "گندم از گندم بروید، جَو ز جَو" کے بالکل برعکس خیر اور نیکی کے نتائج نقصان اور تکلیف کی صورت میں جبکہ شر اور بدی کے نتائج نفع اور آرام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ نتیجۃً انسان شر اور بدی کے اکتساب، اور جھوٹ اور خیانت کے ارتکاب میں زیادہ سے زیادہ جری اور بیباک ہوتا چلا جاتا ہے اور اس طرح بحیثیت مجموعی عالم انسانیت میں جھوٹ اور شر کا غلبہ ہو جاتا ہے ــــــ

ــــ اس پورے فلسفے کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کی بالکل ابتدائی آیات میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں یوں سمو لیا گیا کہ،

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ (العلق آیات ۶، ۷) یعنی کوئی نہیں، انسان سرکشی اور تعدّی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے اس لیئے کہ وہ اپنے آپ کو (گرفت اور عقوبت سے) آزاد دیکھتا ہے!

الغرض از روئے قرآن یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر دنیا میں اکثر و بیشتر جھوٹ ہی کا غلبہ اور ظلم ہی کا دور دورہ رہتا ہے اس طرح گویا خالص اصولی اعتبار سے تو آپ کے سوال کا جواب میں نے اپنے فہم کی حد تک عرض کر دیا ہے ــــــ البتہ آپ کے ظاہری سوال میں ایک دوسرا سوال مضمر ہے اور وہ یہ کہ آخر اس کا حل کیا ہے!

اس کے ضمن میں بھی دو ہی باتیں پیشِ خدمت ہیں جو اصلاً ایک ہی حقیقت کے دو پہلوؤں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک یہ کہ انسان کی حیاتِ دنیوی اس کی اس اصل زندگی کے مقابلے میں بہت حقیر اور بے وقعت ہے جو ابدی اور لامتناہی ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم کا فرمانا یہ ہے کہ "وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝" (العنکبوت آیت ۶۴)

یعنی "یقیناً اصل زندگی تو آخرت کے گھر والی ہے کاش کہ انہیں معلوم ہوتا"
اور جس کے ضمن میں علامہ اقبال کا یہ شعر صد فی صد حقیقت پر مبنی ہے کہ ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

لہٰذا اگر اس عارضی اور بے وقعت زندگی میں جھوٹ کی عملداری سچ کے مقابلے میں زیادہ نظر آئے تو زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں! —— اصل اور ابدی زندگی آخرت کی ہے جس میں اس عالم کے برعکس اصل عملداری اخلاقی قانون کی ہوگی نہ کہ طبعی کی۔ چنانچہ ہر آن اور ہر لحظہ سچ اور حق ہی کا ظہور و غلبہ ہوگا —— جھوٹ اور باطل کا وجود ناپید ہو جائیگا۔ بلحاظ الفاظ قرآنی "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" (بنی اسرائیل آیت ۸۱) یعنی "حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا —— اور باطل تو (اپنی اصلیت کے اعتبار سے) ہے ہی ناپید ہو جانے والی شے!"

دوسرے یہ کہ اس دنیا میں حق و باطل اور سچ اور جھوٹ کے مابین کشاکش و کشمکش میں انسان کا اصل ہتھیار یہی ایمان بالآخرت ہے۔ اگر انسان کو آخرت کا یقین ہوگا تو اس عالمِ مادّی یعنی "جہانِ رنگ و بو" اور سلسلۂ اسباب و علل میں جھوٹ اور ظلم کے غلبے کے باوجود خود سچ اور حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ سورۂ علق کی جن آیتوں کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے ان کے بعد تیسری آیت یہی ہے کہ "إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ" یعنی "یقیناً تیرے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے!" —— گویا کانٹ نے اپنی تالیف "تنقید عقلی عملی" (critique of practical reson) میں جس اخلاقی قانون (moral law) کو وجودِ باری تعالیٰ کے لئے دلیل کے طور پر بیان کیا ہے وہ حکمتِ قرآنی کی رو سے اصلاً عقیدۂ آخرت کی دلیل ہے!

فقط   خاکسار

اسرار احمد

محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب

جنابِ عالی: آپ کی زندگی اور آپ کا فن دونوں بڑے ہمہ جہت ہیں آپ نے انجینئرنگ کے میدان میں بھی اپنی ارفع کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی اعلیٰ ترین ڈگری کے حصول میں بھی اپنی قدرت کا اظہار کیا۔ اس دوران گراں قدر کتب کی اشاعت کے سلسلے میں بھی غیر معمولی رفعت کا احساس کرایا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے متنوع اصنافِ ادب میں اپنی فن کارانہ مہارت کا بھرپور اعتراف کروایا آپ نے تنقید، تحقیق افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری اور شاعری میں بیک وقت اپنے منفرد اور بلند قامت ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ آپ ہمارے ادب کی متنازعہ شخصیت رہے ہیں مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آپ نے ہمیشہ تلواروں کی چھاؤں میں بھی سچ بولنے اور سچ کی آئینہ داری کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے شدید ترین نظریاتی مخالفین بھی آپ کی دیانتِ قلم کے معترف رہے ہیں اسی سبب سے میں آپ کو اس سوال کے جواب کے حوالے سے موزوں ترین شخصیّتوں میں سے ایک شخصیّت سمجھتا ہوں جو اپنے افکار و خیالات کی پیرمائیگی سے ہم سب کو مستفیض فرمائے گی۔

غیاث چودھری

سچ وہ نظریّہ ہے جس کی مزید پرکھ پڑتال کی ضرورت نہیں، یہ ایک ایسی قدر ہے جس کی صداقت جانچی جا چکی ہے اور جس کی عالمگیریّت مسلّم ہے یہی وجہ ہے کہ سچ بلا سوچے سمجھے اور بے ٹوک بولا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ "سانچ کو آنچ نہیں" اس سے بزرگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

سچ دنیا کی سب سے بڑی دفاعی قوت ہے اور معاشرے کا استحکام اس قوت کے بل بوتے پر ہی ظہور میں آتا ہے۔ سچ فرد کو اختیارِ تمیزی نہیں دیتا بلکہ اپنی فرماں روائی تسلیم کرواتا ہے، اور دو اور دو کو چار کہنے پر ہی اصرار کرتا ہے۔ آخری بات یہ کہ سچ کا صرف ایک ہی رنگ ہے اور اس رنگ میں تغیر و تبدل کرنا ممکن نہیں۔

سچ کی یہ خوبیاں اجمالی ہیں لیکن یہ اتنی روشن ہیں کہ ان کو قبول کرنے اور ان کی نظریاتی حمایت کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ اتنی خوبیوں کی قدر کی عملداری کیوں کم ہے؟ اور جھوٹ کو فروغ کیوں حاصل ہے؟

وجہ یہ کہ ہمارے دور میں جھوٹ کو مفید اور منفعت بخش قدر کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ اب جھوٹ سچ کے سکے کا دوسرا رخ نہیں رہا۔ اسے ندی کا دوسرا کنارہ کہنا بھی درست نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ نے سچ کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ سچ اگر کہیں ہے تو وہ شرما کے پردے میں چھپ گیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھیئے کہ سچ کی قدری حیثیت ختم ہو گئی ہے قدری حیثیت تو اب بھی قائم ہے اس عہد نے جھوٹ کو اتنا پالش کر دیا ہے کہ اب وہ جھوٹ نظر نہیں آتا بلکہ سچ معلوم ہوتا ہے اس زمانے کی عملی زندگی میں جتنی آنچ سا ہنچ سے آتی ہے اور کسی چیز سے نہیں آتی، اس لیئے لوگ سچ سے بچتے ہیں اور جھوٹ کا سہارا لے کر اپنی آگ کو گلزار بنا لیتے ہیں۔

میں نے اس موضوع/سوال پر انشائی انداز میں سوچنے کی کوشش کی تو یہ بات سامنے آئی کہ سچ کمزور آدمی کا حربہ ہے اور یہ آپ کو ہمیشہ محوِ تماشائے لبِ بام رکھتا ہے۔ اس کے برعکس جھوٹ جرأت مند انسان کا ہتھیار ہے اور یہ آپ کو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑنے کی ہمت

عطا کرتا ہے۔ سچ آپ کو وعدۂ فردا کے سبز باغ دکھاتا ہے زہر کے گھونٹ پینے پر مجبور کرتا ہے جھوٹ حقیقتِ امروز ہے اور یہ لمحۂ موجود کا رس جو لطیف بھی ہے اور شیریں بھی آپ کے سامنے بلّوریں کنٹر میں پیش کر دیتا ہے سچ کا مزاج آمرانہ ہے اور جھوٹ کا جمہوری، دنیا کی مقبول جمہوریتیں جھوٹ اس تواتر سے بولتی ہیں کہ یہ سچ نظر آنے لگتا ہے اور آپ ایک معصوم النہان کی حیثیت میں اس پر یقین کر لیتے ہیں۔

اب ذاتی بات کو بھی میں انشائیہ کے انداز ہی میں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

غیاث چودھری صاحب! سچ زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے، سقراط جیسے دانش ور نے سچ کا پرچم بلند رکھنے کے لیئے زہر کا جام قبول کر لیا تھا۔ میں سچ سے بے اندازہ محبت کرتا ہوں۔ لیکن میں زہر کا جام تھامنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ مجھے نیزے کی اَنّی سے خوف آتا ہے میں یزید کے تیر سے مرنا نہیں چاہتا۔ جھوٹ مجھے ہرگز پسند نہیں میں اس سے بے دریغ نفرت کرتا ہوں۔ لیکن جھوٹ میرے گرد و پیش میں سجا سنورا ہر جگہ موجود ہے میں اسے محسوس بھی کرتا ہوں، یہ مجھے نظر بھی آتا ہے۔ لیکن میں بزدل، ضرورت مند اور دنیا دار آدمی ہوں، اسے دھتکار کر پرے ہٹانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ شاہراہ ملت پر میرا اور اس کا سامنا جہاں بھی ہوتا ہے میں اسے قریب بلاتا ہوں۔ نرمی سے پچکارتا ہوں۔ اس کی نازک پشت کو سہلاتا ہوں۔ اور پھر غیر شعوری طور پر اس کی لمبی تھوتھنی پر دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت پھیرتا ہوں، جھوٹ سعادت مند کتے کی طرح دم ہلاتا ہے اور پھر اچھل کر میری ہی گود میں آ بیٹھتا ہے۔ میں ہزار کٹھور سہی لیکن محبت کے اس بلاوے سے منہ کیسے موڑ سکتا ہوں۔ سچ نے یہ محبت مجھ پر کبھی ارزانی نہیں کی۔ یہ جب میرے قریب آتا ہے خارپشت کی طرح میرے گریبان کو تار تار کر دیتا

ہے۔ پر سچ راہِ یقین ہے۔ میں اس میں پختہ اعتقاد رکھتا ہوں۔ جھوٹ جادۂ عمل ہے۔ اس پر چلے بغیر زندگی کامیاب نہیں ہوتی۔ چنانچہ سچ انحطاط پذیر ہے۔ جھوٹ روز بروز فروغ پا رہا ہے۔

غیاث: چودھری صاحب، آپ میں ہمت اور استطاعت ہے تو سچ کا دامن تھام لیجیے میں آپ کے لیے زہر کا جام تیار کروا تا ہوں۔

انور سدید

محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ

جناب عالیہ، آپ نے فکشن اور ڈرامے کے ذریعے نہ صرف اپنے ارفع و اعلیٰ جذبات و افکار کی ترجمانی کی ہے بلکہ ہمارے ملک کے باسیوں کی آرزوؤں، امنگوں، آنسوؤں اور پیاسوں کی بھرپور عکاسی بھی کی ہے اور یہ عکاسی ہمیشہ انتہائی ہمدردانہ اور غمگسارانہ رہی ہے۔ آپ کے فن میں انسانی ہمدردی اور غمگساری اپنے آپ کو پیغمبرانہ نہج پر ظاہر کرتی ہے۔ آپ کے فن کا رنگ روپ ایک ایسی انفرادیت کا حامل ہے جو برسوں کے ہنرمندانہ مجادلے کے بغیر کسی بھی فنکار کو کبھی میسر نہیں آتی۔ اس مجادلے کا قابل فخر پہلو یہ ہے کہ اس میں فنکار کے تہذیبی ارتقاء کا سراغ ملتا ہے۔ اگر میں آپ کے بارے میں اختصار سے کام لوں تو یہ کہوں گا کہ آپ کی حیثیت ادب میں مینارۂ نور کی ہے۔ بایں وجہ میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کی طرف سے میرے سوال کا جواب متعلقہ مسئلے پر ایک معتبر شہادت قرار پائے گا وہ شہادت جس میں ہمارے قارئین کے لیئے روحانی آسودگی اور جذباتی طمانیت کا وافر سامان ہو گا۔ غیاث چودھری

محترمی غیاث چودھری صاحب

السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔ جو کچھ آپ نے میری تحریر کے متعلق رقم کیا ہے اس کے لیئے بڑی ہی مشکور ہوں۔

میں آپ کے سوال کا جواب تحریر کر رہی ہوں حالانکہ میں اپنے آپ کو اس کے جواب کا اہل نہیں پاتی اور محسوس کرتی ہوں کہ اس کا جواب تو کوئی فلسفی ہی دے سکتا ہے۔

سوال چونکہ دو حصوں میں ہے اسی لیے جواب بھی دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے اور پچھلے حصے کا جواب پہلے رقم کرنا زیادہ مناسب لگتا ہے۔

ہم سب مٹی کے بنے ہوئے خطا کار پتلے ہیں اور جسمانی، روحانی اور ذہنی طور پر کمزور رہیں۔ اتنی ساری کمزوریوں کے باوصف انسانی روح میں یہ خوبی بھی موجود ہے کہ وہ ارفع واعلیٰ اور بہتر اشیاء اور خیالات کی نہ صرف جانچ پڑتال ہی رکھتا ہے۔ بلکہ جی جان سے چاہتا ہے کہ اعلیٰ اقدار اور بہتر اشیاء اس کے ارد گرد اور اندر ہوں۔ اسی تضاد سے زندگی میں بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں انسان کی زندگی معمولی ہوتی ہے لیکن اس کے ideal (آدرش) بہت خوبصورت اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ کمزوریوں کی وجہ سے ان آدرشوں پر چل نہیں سکتا لیکن امر الٰہی کے تحت ارفع چیزوں کی محبت دل سے نہیں جاتی۔ کچھ خوش نصیب اس تضاد کو حل کر پاتے ہیں یا تو وہ دل سے قبول کر لیتے ہیں کہ وہ فقط پانچ پاور کے بلب ہیں اور زیادہ روشنی پھیلا نہیں سکتے یا پھر سب کچھ تج کر ملنگ ٹور بن جاتے ہیں لیکن زیادہ لوگ اس تضاد کو حل کر نہیں سکتے اور ریاکاری کا شکار ہو جاتے ہیں ایسے میں وہ سچ سے محبت تو کرتے ہیں۔ لیکن جھوٹ بولتے رہتے ہیں یہی معاشروں کی بڑی ٹریجڈی ہے کہ ان میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس کام میں محنت زیادہ پڑتی ہو وہ کرنا مشکل ہوتا ہے اچھا لباس پہن کر ایکٹرس کی طرح خوبصورت لگنا آسان ہے لیکن بی بی رابعہ بصری کی طرح زندگی بسر کر کے نام پیدا کرنا آسان نہیں۔ اخلاقی زندگی کی بنیاد سچ ہے اور یہ بڑے جان جوکھم کا کام ہے ——— معمولی لوگ اس مصیبت کو کیسے اپنا سکتے ہیں؟ جب کہ سچ بولنا، سچ بسر کرنا، سچ سننا اور اس عادت کو راسخ کرنے میں ایک عمر بسر ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ سچ بولنے سے کہیں زیادہ سچ سننے کی صلاحیت مشکل سے پیدا ہوتی ہے، جو معاشرے مضبوط افراد سے بنے ہوتے ہیں وہاں ہی سچ کی عملداری بھی زیادہ ہوتی ہے۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ والسلام

نیاز مند بانو قدسیہ

محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ

جناب عالیہ، آپ ہمارے معاشرے کی ان سربرآوردہ شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنہیں ہم خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ہمہ صفت موصوف قرار دیتے ہیں۔ آپ نے افسانوی ادب میں ایک نہائیت منفرد مقام حاصل کیا ہے فکشن میں بھی آپ کی کارکردگی بڑی غیر معمولی تصور کی جاتی ہے۔ آپ کی کالم نویسی کے اندر بھی ایک خاص قسم کی جاذبیت پائی جاتی ہے اس جاذبیت میں شعری حوالے بالخصوص سرائیکی شاعری کا برمحل استعمال ہمیشہ قارئین کے لیے پرکشش رہا ہے اور آپ کے منجھے ہوئے شعری ذوق کا آئینہ دار رہا ہے آپ کا مقررانہ جوہر اس قدر پر وقار اور مسحور کن ہے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں آپ کی ادیبانہ ثروت کی حامل تقریریں سننے کا موقع ملا ہو۔ آپ سیاسی اعتبار سے بھی اہم مراتب پر فائز رہی ہیں یوں آپکو اپنے معاشرے کے ممتاز سیاسی رہنماؤں سے رابطہ رکھنے کا موقع ملا ہے اور عوام کے ہر طبقے سے بھی ربط ضبط استوار کرنے کی سہولتیں میسر آتی رہی ہیں جس کے نتیجے میں آپ کی بصیرت کو ان کی نفسیات سے آگہی ملتی رہی ہے لہٰذا میں بجا طور پر خیال کرتا ہوں کہ آپ میرے سوال کا جواب فراہم کر کے ہمارے قارئین کو اپنے افکار کی پُرمائیگی سے مستفیض فرمائیں گی۔

غیاث چوہدری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

”سچ کا دم گھٹتا رہا ——“

ہر دور میں سچ اور عورت کا دم گھٹتا رہا، فرق صرف اتنا ہے کہ لب گور بھی سچ کو بچانے والے سقراط آ گئے۔ جبکہ عورت کے سسکنے کو ظالم نے ادا جانا۔ — ؟

آپ کی خواہشیں بھی بہت معصوم اور بے لاگ ہیں۔ آپ چاہتے ہیں۔ دنیا کا

ہر انسان سچ بولے اور سچ کا پرچار کرے ـــــ اور خالقِ کائنات کی انتظامیہ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھی رہے ...... آپ پوچھتے ہیں "سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں کم کیوں ہے ؟ جب کہ ہر کوئی سچ ہی کا حامی اور دعویدار ہے"۔ اس لیے کہ ہر ایک نے اپنی ذات کا سچ الگ سے گھڑ لیا ہے ۔ یہ راستہ نسبتاً آسان تھا ۔

یا یوں کہہ لیجئے کہ ـــــ سچ ایک ہاتھی ہے جو اندھوں کی نگری میں گھومتا ہے جو اندھا اس کو جہاں ـــــ سے ہاتھ لگاتا ہے ۔ اسی حصے کو سچ سمجھ لیتا ہے ۔ نہ کوئی پوری طرح دیکھ پایا ـــــ نہ پوری طرح کوئی محسوس کر پایا ۔ تو عملداری کیسے ہو ـــــ ؟

گویا سچ تو موجود ہے ۔ نگاہ کور ہو گئی ہے جبکہ ہر کوئی دعویدار ہے کہ وہ بخوبی دیکھ سکتا ہے ـــــ ؟ کیا دیکھ سکتا ہے ـــــ اور کتنا دیکھ سکتا ہے ـــــ ؟

ایک سچ کی تلاش میں جائیں گے ۔ تو سوالات کا قافلہ آپ کے ساتھ چل پڑے گا کچھ وجدان کے اندر کے سوال اور کچھ امکان کے باہر کے سوال ـــــ ؟

آپ بتائیں تو سہی سچ ہے کیا ـــــ ؟

خدا کی ذات سچ ہے ۔ سب جانتے ہیں مگر کتنے مانتے ہیں ؟ دن رات کہتا ہے میں تمہاری شہ رگ کے قریب ہوں ۔ کتنوں نے محسوس کیا ہے کتنوں نے اس کی آواز سنی ہے رگ جاں کے قریب بیٹھا ہوا خدا معاملات کرتے وقت اتنا دور کیوں ہو جاتا ہے ـــــ ؟

اور بوقتِ ضرورت ، لوگ اپنا اپنا خدا الگ ـــــ کیوں چن لیتے ہیں ؟ مصلحت حاجت ، محبت ، نفرت ، عداوت ـــــ ان کی دھند میں خدا دھندلا جاتا ہے ۔ سچ کا چہرہ دھندلا جاتا ہے ۔

مذہب سچ ہے ـــــ ؟

تو کہاں ہے مذہب ـــــ ؟ اور کتنی شکلوں میں ہے مذہب ـــــ ؟ اور کتنے فرقوں میں ہے مذہب ـــــ ؟ اور کتنے تفرقوں میں ہے مذہب ـــــ ؟ ایک خدا کو پکارنا تھا اور ایک نبیؐ پر ایمان لانا تھا ـــــ پانچ وقت زنجیر ہلانا تھی

بس ذرا سی بات تھی۔ سچ کے پردے سے نکلی تو ہر داعی نے اس کا افسانہ کر دیا۔ اور خدا سے بیگانہ کر دیا۔

مصلّٰے بھی ایک سچ ہے۔ مگر مصلّے کی بولی لگی کبھی ایک مسجد میں کبھی دوسری مسجد میں ـــــ کتنے اور سچ ہیں۔ نیلام گھروں میں جن کی بولی لگتی ہے۔ بیچے جاتے ہیں۔ خریدے جاتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں جب پہلی بار سچ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی۔ تو دنیا میں پہلا انسانی قتل ہوا۔ قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا ـــــ لیکن کوفہ کی گلیوں تک پہنچتے پہنچتے اس کا ردِعمل یوں سامنے آگیا کہ سچ کبھی قتل نہیں ہو سکتا ـــــ صدیاں اور قرن اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔ سچ سوا نیزے پہ اپنے آپ کو منواتا ہے۔ جس طرح حسین رضی اللہ عنہ نے سر دے کر منوایا۔

جس سچ کی آپ بات کر رہے ہیں وہ سچ خدائے قدوس کی ایک روشنی ہے جو ہر انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے اس کا باہر سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ہر وہ انسان جو اس روشنی کو برداشت کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ وہ اس روشنی کو اپنے نفس کی پھونکیں مار مار کر بجھا دیتا ہے جب انفرادی طور پر لوگ اپنے اندر کے سچ کو مار رہے ہیں تو پھر اجتماعی طور پر سچ کی حکمرانی کہاں پہ نظر آئے ـــــ؟

ہاں ابھی تک دنیا میں وہ پر اسرار بندے موجود ہیں۔ جو دل کے اندر سے پھوٹنے والی اس روشنی کو پہچان لیتے ہیں۔ اور اسے نفس کی پھونکوں سے بجھاتے نہیں، اس روشنی کو بچانے کی خاطر وہ کرسیوں کے نیچے، دفتروں کے جلسے میں، جہاد کے میدانوں میں اور نیم تاریک حجروں میں چپ چاپ جلا کرتے ہیں۔

انہی لوگوں کی وجہ سے دنیا میں سچ کا نام باقی ہے اور اس کائنات کا استحکام اور تسلسل قائم ہے۔

انہی کے بارے میں باری تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے :-

مَنْ طَلَبَنِیْ وَجَدَنِیْ

وَمَنْ وَجَدَنِی عَرَفَنِی

وَمَنْ عَرَفَنِی اَحَبَّنِی

وَمَنْ اَحَبَّنِی عَشَقَنِی

وَمَنْ عَشَقَنِی قَتَلْتُهٗ

وَمَنْ قَتَلْتُهٗ فَعَلَیَّ لَازِمٌ دِیَتُهٗ

وَدِیَتُهٗ اَنَاہ

ترجمہ: جو مجھے طلب کرتا ہے۔ پا لیتا ہے۔

اور جو پا لیتا ہے وہ مجھے پہچان لیتا ہے۔

اور جو مجھے پہچان لیتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔

اور جو مجھ سے محبت کرتا ہے میرا عاشق ہو جاتا ہے

اور جو میرا عاشق ہو جاتا ہے میں اسے مار ڈالتا ہوں

اور جس کو میں مار ڈالتا ہوں۔ اس کی دیت مجھ پر لازم آ جاتی ہے۔

میں ہی اس کی دیت ہوں!

بشریٰ رحمٰن

"وطن دوست" لاہور

۲ ستمبر ۱۹۸۹ء

محترم پروفیسر سیّد تنویر مرشد صاحب

جناب عالی: آپ ہمارے عہد کے اُن جواں فکر اور جواں سال نابغوں میں سے ہیں۔ جن کی شخصیت نے تین نمایاں جہتوں میں اپنا اظہار کیا ہے۔ آپ نے رنگ اور خطوط سے گرانقدر تصاویر بنائی ہیں، حروف سے قیمتی مقالے تحریر کیئے ہیں، اور حرف و صوت کی آمیزش سے بلند پایا شاعری کی ہے۔ آپ نے ان تینوں حوالوں سے اپنے ناظرین و سامعین کو اپنی ذات کی ان الیلی وسعتوں، گہرائیوں اور رفعتوں کا ادراک کروایا ہے۔ جن کے وسیلے سے ہم انسانی سائیکی psyche کے پیچ در پیچ مسائل اور احوال و کوائف سے پُرمایہ آگہی حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے کائنات اور ماورائے کائنات صداقتوں کو علامتی انداز میں اپنی تمام تر معنویتوں اور کرب ناکیوں کے ساتھ پیش کرنے کا اعزاز بھی پایا ہے۔ آپ نے اپنے فکر و نظر کے جواہر ریزوں کو نئی نسلوں تک جامعاتی سطح پر تعلیم و تدریس کے ذریعے منتقل کیا ہے۔ آپ کا یہ کارنامہ بھی سالہا سال کے عرصے پر محیط ہے۔ آپ کے ان غیر معمولی عطیات کا برملا اعتراف ہر شعبۂ زندگی کے بیشتر سربرآوردہ دانشوروں نے کیا ہے اس لیئے میں بجاطور پر توقع کرتا ہوں کہ آپ میرے سوال کا سیر حاصل اور ہمہ جہت جواب فراہم کر کے مجھے اور اپنے بیشمار مداحوں کو ممنون ہونے کا موقع دیں گے۔

غیاث چودھری

محترم غیاث صاحب! اس سے پہلے کہ میں آپ کے سوال کا جواب دوں میں آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک عظیم سوال ہے اور اس سوال کے زمرے میں دو چیزیں اور ہیں اور وہ ہیں۔ کہ حیات

کیا ہے ، روح کیا ہے اور پھر ہے پر سچ کیا ہے - آپ کے سوال کے جواب میں میرا جواب یوں ہے -

ماسوا سب کا سب مایا ہے - "ما" کے نہیں سے جو جو کچھ ترتیب پا چکا ہے اس کا "یا" سوا ہے یعنی نہیں ہے کچھ مگر سوا (دیوتا) تو یوں سچ ہے یا جھوٹ

روشنی ہے یا اندھیرا

تیرا ہے یا میرا

یا تُو ہے یا میں ہوں کے رازیدہ اُلجھاؤ میں ہر سلجھاؤ کا نصیب ہے گویا ہر معاملے کے دو صاف راستے ہیں پہلا "ما" کے نہیں کا دوسرا "یا" کے متبادل یعنی سوا کا - رازیدہ الجھاؤ میں شک اور سلجھاؤ میں یقین کا راستہ ہے - دونوں کے درمیان سوچ ہے - جسے دونوں کھینچ رہے ہیں - سوچ کا ایک طرف لگ کر جم جانا ہے یا دونوں کے درمیان چلنا ہے یا پھر کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف ہو جانا ہے -

یوں سچ اس کھیل کے باہر سے ہمارے معلوم اور نامعلوم کے عالم میں ایک کیفیت کا وجدان بن کر چمکتا ہے جس سے فیصلہ کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے بلکہ راستوں کی صورت تک صاف دکھائی دینے لگتی ہے اسی سے ہمارا ہونا قائم ہوتا ہے - مگر سچ پھر بھی ظاہر نہیں ہوتا وہ محض جھوٹ کی نشاندہی کرتا چلا جاتا ہے یوں ہم اپنی محدودیت کے عالم ماسوا سے سوا کے نامعلوم تک ازل سے سفر پہ ہیں اور ابد تک یا شاید سدا تک رہیں گے

تنویر مرشد

محترم پروفیسر جمیل ملک صاحب

جناب عالی ــــ جو لوگ آپ کی دلآویز شخصیت کو قریب سے مشاہدہ کرنے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ آپ کے دھان پان وجود کے اندر ایک ایسی ہستی قیام پذیر ہے جسے حسنِ سیرت کا ہمالیہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ غیر معمولی قابل رشک مقام اگرچہ اس پاکیزہ اور منزہ لہو کا بھی فیضان ہے جو آپ کی رگوں میں موجزن ہے تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے یہ مقام جلیلہ اپنی انتھک اور ہمہ جہت مساعی سے بھی حاصل کیا ہے جس کی وجہ سے آپ دوسروں کے لیئے مینارۂ نور بن گئے ہیں۔ آپ نے علمی دیانت، منصبی خلوص، معیاری مطالعہ، مثالی تفکر، اچھوتی تخلیق کاری اور منفرد تنقید نگاری کے جو ارفع نمونے اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں کے ذریعے قارئین کے سامنے پیش کیئے ہیں ان کی قدر و منزلت کا تعین ابھی ہمارے عہد پر قرض ہے مگر آپ تو قرض حسنہ کی بارش کرنے والے وہ عظیم انسان ہیں جنھیں کبھی اپنے سرمائے کی واپسی کی آرزو نے بے چین نہیں کیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ ضرور ہمارے سوال کے تسلی بخش اور بصیرت افروز جواب کی فراہمی سے ہم سب پر مذکورہ قرض کے اضافے کا باعث بن کر ہمیں مزید ممنون فرمائیں گے۔

غیاث چودھری

فراقؔ نے کہا تھا

؎ میں بھی سچا، تم بھی سچے
عشق میں سچ ہی کا رونا ہے

حقیقت یہ ہے کہ "سچ کا یہ رونا" صرف قصۂ حسن و عشق میں ہی نہیں، زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے۔ اور اس وقت تک رہے گا جب تک انسان پوری سچائی کو دریافت نہیں کر لیتا۔ انسان ازل سے اب تک کائنات کی آخری مکمل حقیقت یا حقیقتِ مطلق کی تلاش میں ہے اور تلاش کے اسی سفر میں آگے بڑھتا ہوا جوں جوں ایک امکان کے بعد دوسرے امکان اور ایک حقیقت کے بعد دوسری حقیقت دریافت کرتا چلا جا رہا ہے اتنی ہی اس پر کائنات کی سچائیاں بھی روشن تر ہو رہی ہیں اور غالب نے جس "قریب ہستی" کو حلقۂ دام خیال" کیا تھا، انسان جست پہ جست بھرتا ہوا اس سے باہر نکل کر مسلسل سچائی کی روشنی میں آ رہا ہے۔ سچائی کی دریافت کا یہ ارتقائی تغیر پذیر اور انقلابی سفر عروجِ آدمِ خاکی کے ساتھ ساتھ طلسمِ زمان و مکاں کی حدود کو توڑتا ہوا ابدیت کی سچائی کی کھوج میں یوں ہی پھیلتا چلا جائے گا اور کائناتی اور آفاقی سطح پر منزل بہ منزل حق کے مقابلے میں باطل کی عملداری کم ہوتی چلی جائے گی۔ رہا دنیاوی، معاشرتی اور سماجی سطح پر جھوٹ کے مقابلے میں سچ کی عملداری کم ہونے کا مسئلہ۔ تو اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ سچائی کا راستہ تلخیٔ کام و دہن کی آزمائشوں کا راستہ ہے اور اس راستے پر چل کر حصولِ منزل کا خواب بہت دیر سے پورا ہوتا ہے جب کہ اپنی منفعت اور ہوس کا مارا ہوا انسان جھوٹ کا سہارا لے کر اس منزل پر بہت جلد پہنچنے کے مرض میں مبتلا ہے اور معاشرے میں اپنی اور "جھوٹ کی ساکھ" برقرار رکھنے کے لیئے اُسے اپنے چہرے پر کتنے ہی سچائی کے نقاب ڈالنے پڑتے ہیں تاہم علم و آگہی کی روشنی اب اتنی پھیل چکی ہے کہ کوئی جھوٹا شخص بھی اپنے آپ کو محض جھوٹا ظاہر کر کے اپنا مطلب پورا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج ملکی اور قومی سطحوں سے لے کر عالمی سطح تک بھی حق و باطل دونوں ہی صفوں سے سچائی، امن و آشتی، اور جمہوریت و اخوت کے ہی نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ اور یہ آدیزش اس وقت تک جاری

رہے گی جب تک قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر عالم انسانیت کے لئے ایک ایسا نظام اقتدار مرتب نہیں کر لیا جاتا جو ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے شرفِ انسانیت کی گواہی دیتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل انسان کی مسلسل جدوجہد اور کشمکش انقلاب کا متقاضی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو قطعی طور پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ افقِ انسانیت پر پوری صداقت کا سورج کب طلوع ہو گا۔ تاہم اس امر کی بشارت بہرحال دی جا سکتی ہے کہ جوں جوں انسان اپنا پورا نظام اقتدار اور سماجی معاشی اور آفاقی ڈھانچہ منقلب کرتا ہوا شرفِ آدمیت کی گواہی ڈھونڈ کر لانے میں کامیاب ہوتا چلا جائے گا توں توں جھوٹ کے مقابلے میں سچ کی عملداری بھی بتدریج بڑھتی چلی جائے گی تاآنکہ وہ کسی پانچویں درویش کے قالب میں ڈھل کر یوں کہہ سکے گا۔

چار درویش کہہ چکے اپنی
ہے مرے پاس پوری سچائی
مجھ کو کہتے ہیں پانچواں درویش

جمیل ملک
۲۵ جنوری ۱۹۸۹ء

محترم پروفیسر جوگندر پال صاحب

جناب عالی: آپ برصغیر کے اُن نامور دانشوروں میں سے ایک ہیں جن کی حیثیت افسانہ، ناول، تنقید اور ترجمہ، ادب کے چاروں شعبوں میں مسلمہ ہے یہ شہرت آپ کی سالہاسال پر پھیلی ہوئی شبانہ روز محنت، مطالعہ اور تدبّر پر استوار ہے۔ آپ نے اپنا کیریئر اپنی لاتعداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر حاصل کیا ہے۔ اس دوران جہاں آپ نے سچی اقدار کی عملاً پرورش کی ہے۔ وہاں جھوٹی اقدار کو مسمار بھی کیا ہے۔ آپ کی عظمت و رفعت کا قلعہ انا کی کھوکھلی توسیع سے ظہور پذیر نہیں ہوا بلکہ انا کی اس نشوونما سے وجود میں آیا ہے جسے محنت، ایثار اور خلوص کے ساتھ آپ نے اپنے تازہ لہو سے سینچا ہے اس ساری تگ و تاز نے آپ کو انسانی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع فراہم کیا ہے انسانی زندگی کے تمام محاسن و معائب کی جزئیات اور تفصیلات آپ کی نگاہ میں ہیں۔ لہٰذا میں بجا طور پر توقع کرتا ہوں کہ آپ اپنے تجربات و مشاہدات کے حوالے سے دوسرے لوگوں کو بھی آگہی بخشیں گے تاکہ وہ میرے سوال کے معنوی سیاق و سباق میں اس کا تسلی بخش جواب حاصل کرسکیں جو انہیں آج کی عمرانی صورتِ حال میں بار بار پریشان کرتا ہے۔

غیاث چودھری

جیسے آپ نے کہا کہ تمام مکاتیبِ فکر سچائی کی علمبرداری تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس پر پورا نہیں اترتے تو اس سے ایک سوال ابھر کر سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر

سچائی کسی مکتبۂ فکر سے وابستہ ہوتی یعنی وہ ملکیّت کی اسیر ہوتی تو کسی حد تک مسئلہ حل ہو جاتا کہ فلاں مکتبۂ فکر نے اس طرح سچائی کی نشاندہی کی ہے اور وہ اس پر پورے اُتر آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سچائی سرے سے مکتبی ہے ہی نہیں بلکہ سچائی واردا تی ہوتی ہے اس لیئے جب تک آپ سچائی کو اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنا پاتے جب تک آپ کی سوچ، آپ کے رول، آپ کی تقریر اور آپ کی تحریر میں ایک طرح سے یک جہتی پیدا نہیں ہو پاتی اس وقت تک آپ سچائی کی دعویداری نہیں کر سکتے۔ اگر میں یہ کہوں گا کہ میں نے سچائی پر بحث کرتے ہوئے پوری کتاب رقم کر دی ہے تو اس سے یہ علامت نہیں بنتی کہ میں واقعی سچائی کو جاننے لگا ہوں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ سچائی کا معصوم چہرہ آپ کو کسی جنگلی یا اکھڑ آدمی کے چہرے سے زیادہ عیاں ہوتا ہوُا لگے بہ نسبت اس کے کہ کوئی فلسفی اس پر بھاری بھرکم باتیں کر رہا ہو کیونکہ طبعاً اور مزاجاً سچائی جیسے میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے وارداتی ہوتی ہے لہٰذا جب تک آپ عملی طور پر سچائی کے phases سے نہیں گذرتے، سچائی کے کرۂں سے نہیں گذرتے۔ اس کی تمام صعوبتیں آپ کے تجربے میں سما نہیں جاتیں اس وقت تک آپ سچائی کو پہچان نہیں پائیں گے۔ کیونکہ آپ خود کو مصلحتاً سچا نہیں کہہ سکتے۔ آپ بظاہر سچے ہوتے ہوئے بھی اگر نتیجتاً ایسے لگیں کہ آپ سچ نہیں بول رہے بلکہ کسی خاص موقع پر بظاہر سچ بولتے ہوئے بھی کسی کو زک پہنچانے کے لیئے مصلحتاً سچائی کا ذکر کر رہے ہیں تو اس سے جو نتیجہ برآمد ہو گا وہ سچائی کی روح کی عکاسی نہیں کرے گا میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک عدالت کا case لے لیجئے جہاں پر عام طور پر سچ نہیں بولا جاتا بلکہ جھوٹے آدمی کو سچا ثابت کیا جاتا ہے لیکن سچ کا صحیح مفہوم اس سے نہیں نکلتا کہ آپ نے کسی کو سچا ثابت کر دیا ہے بلکہ سچ کا صحیح مفہوم اس وقت سامنے آتا ہے

جب آپ کو کوئی آدمی سچا محسوس ہو رہا ہو لیکن آپ یہ ثابت نہ کر سکتے ہوں کہ وہ سچا ہے ۔ کیونکہ اس کے تعلق سے کائیاں قسم کے لوگوں نے ایسی دلیلیں دی ہیں کہ وہ تو چاروں طرف سے دلیلوں میں گھر گیا ہے اور سچائی کا تو وہاں دم گھٹ کے رہ گیا ہے اور وہی شخص جو بالکل سچا ہے اس کو قانونی طور پر دلیلوں اور مکتبۂ فکر کی وابستگی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہی مجرم ہے اور اس کو ہی تو پھانسی پر چڑھانا ہے ۔

میرے نزدیک سچائی کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ ایک experience ہے یہ سوچ کا حیلہ نہیں ہے یعنی مناظرے میں خود کو سچا ثابت کرنے کا ذریعہ نہیں ہے دوسرا پہلو یہ ہے کہ سچائی اگر واردات ہے تو آپ دیکھیں گے کہ مختلف ادوار میں اس کا سیاق بدلتا رہتا ہے ۔ میں خدا کو بہت بڑا بہت عظیم فنکار تسلیم کرتا ہوں کیونکہ شروع سے لے کر آج تک کی تمام کی تمام وارداتیں جو کہ زندگی میں بیتی ہیں ان سب میں کہیں بھی کسی بھی مقام پر تکرار نہیں ہے ہر واقع لاثانی ہے ہر چہرہ لاثانی ہے کیونکہ زندگی کا سیاق ہر دور میں بدلتا رہتا ہے یعنی ہم تو گزر جاتے ہیں لیکن وقت اپنی جگہ اٹل رہتا ہے اور سچائیاں اٹل ہونے کے باوجود ہمارے گزر جانے سے ان کا سیاق بدلتا رہتا ہے اور بدلتے ہوئے سیاق کو ہر دور میں آنے والی مخلوق دریافت کرتی ہے جس سے اس کی جوشش آفرینی بنی رہتی ہے اب اگر کوئی یہ کہے کہ سچائیاں بوڑھی ہو چکی ہیں تو یہ بھی سچائی کو سمجھ نہ پانے کے مترادف ہو گا کیونکہ اگر اس کا سیاق بدلتا ہے تو آپ کی شرکت کے ذرائع بدلتے ہیں اور ذرائع بدلتے ہیں تو نوعیتیں بدلتی ہیں اور اس طرح آپ کی نئی جوشش آفرینی کے اسباب بھی پیدا ہوتے ہیں تو معاملہ یہاں پہنچ کر نتیجہ خیز لگتا ہے جہاں آپ سچائی کو، سوچ کو، اس کے عمل کو اس کی تحریر کو ایک ہی سطح پر تصور کریں ۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو آپ کو ٹیچر قسم کا مخصوص استاد

جس کا کام پیشہ ورہی کرنا ہے بھروسہ کے قابل لگتا اگر وہ بھروسہ کے قابل نہیں لگتا اور اس کے مقابلے میں وہ شخص لگتا ہے جس نے سچائی کو بھگتا ہے۔ سچائی کو جھیلا ہے اور جھیل جھیل کر اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص نے مناظروں میں پڑنے کی بجائے خاموشی کے ساتھ سچائی کے تمام پہلوؤں کو دیکھا، پرکھا اور اس کی تمام شکلیں اس پر وا ہوئیں اور وہ واقعتاً اس کی روح میں اتر کر اس کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اس قابل ہو گیا کہ وہ سچائی کی علمبرداری کرے۔

میں نے جو جھیلنے کی بات کی ہے وہ یہ ہے کہ سقراط نے ہنستے ہنستے زہر کا پیالہ پی لیا تھا کیونکہ اس کی بھی یہی پرابلم تھی اور حضرت عیسیٰ بھی کہ اس پر چڑھ گئے تھے تو اُن کی بھی یہی پرابلم تھی وہ بھی سچائی کی خاطر قربان ہو گئے تھے۔ لیکن جو لوگ مزاحمت کر رہے تھے اُن کے پاس کیا تھا انہوں نے تو اپنی واردات کے ذرائع بھی برباد کر دیئے تھے جن کے وہ دعویدار تھے وہ سب کچھ عارضی تھا جو ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا —— میں پوچھتا ہوں کیا آپ اپنا نام ہیں! کیا آپ اپنی شکل ہیں! کیا آپ اپنا وجود ہیں! ان سب چیزوں کو تو زوال ہے یہ سب ختم ہو کر گمان کی طرح لگیں گی لیکن زندگی کا جوہر وہ چیز ہے جو بعد میں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے اس لیئے جب تک زندگی ہے آپ کا جوہر بھی زندہ رہے گا اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ سچائیاں جو کہ topical ہیں ہنگامی ہیں، یہ تو ختم ہو جائیں گی۔ لیکن وہ سچائیاں جو زوال پذیر نہیں ہیں جو verities ہیں ان کے scope کو بڑھانا کسی مہذب ترین شخص کا فعل ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ایک نہائیت اہم نکتہ کو بھی مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ سچائیوں کا بہت زیادہ ذکر روا رکھتے ہیں اور مناظروں کی صورت میں سچائی کی زیادہ باتیں کرتے ہیں اور اپنی گفتگو کو کسی مکتبۂ فکر سے منسلک کر کے خود ہی یہ تصور کر

لیتے ہیں کہ انھوں نے سچائی کی کوئی نئی تھیوری معلوم کر لی ہے لیکن وہ کس وجہ سے کوئی اچھا کام سرانجام نہیں دے پاتے میں ان کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

عام طور پر ہر مذہب اور ہر مکتبۂ فکر کا بڑا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے اوروں کو بڑھائی ملے اور وہ نیکیوں کی پیامبری کر سکے لیکن اس کے محدود قوانین اس تحریک کی وسعت میں حائل رہتے ہیں۔ اب آپ اس شخص کے بارے میں سوچیئے جو کہ سچائیوں کی باتیں نہیں کرتا لیکن اپنا کام وہ جو بھی کرتا ہے فرض کیجیئے جوتے گانٹھتا ہے اور صبح سے شام تک اپنا کام اس قدر لگن سے کرتا ہے کہ اس پر رقص کی کیفیت طاری رہتی ہے اور وہ اپنے کام کو اپنے فن کی بلندیوں تک لے جاتا ہے کہ وہ لاشعوری طور پر اپنی شخصیّت کو اپنے فن میں منتقل کر دیتا ہے جس کو دیکھ کر کوئی یہ کہتا ہے کہ بھئی یہ تو چنن چمار کا بنا ہوا جوتا ہے ایسا جوتا اور کوئی نہیں بنا سکتا تو اس طریق پر چلنے والے بھی پیامبر ہوتے ہیں میرا مطلب ہے کسی بھی پیشے کے اعتبار سے اس کی perfectionism کا اضطراب اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ وہ شخص زندگی کا سب سے بڑا سچ بول رہا ہے کیونکہ اس کی ذات کا اس فن میں منتقل ہو جانا بھی سچائی کی purpounding ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص سچ کے بارے میں قطعی طور پر نہ جانتے ہوئے بھی معصومیت سے اپنے کام میں ڈوب کر بالواسطہ طور پر سچ بول رہا ہوتا ہے۔ اس لیئے میرا اصرار اس بات پر ہے کہ سچائی کو رسمیت کا اسیر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اُسے کھلا چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ اس طرح انسانی تمدن کے scope میں اضافہ ہو گا اور اس کا سیاق آزاد تر سطح پر بلنے دینا چاہیئے اس طرح ہمارا آنے والا انسان مہذب تر ہو گا لیکن اگر ہم اس کو کسی نشاندھی سے پابند کر دیں گے اسے کسی خانے میں بند کر

کر دیں گے تو اس کا نتیجہ شاید یہ نکلے گا کہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکے گا لہٰذا انسانی سفر کے بارے میں جہاں سے میں نے بات شروع کی تھی۔ وہیں پر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ انسانی ارتقاء کو جاری رکھنے کے لئے سچائیوں کا مختلف طریقوں سے دم گھٹنے کی بجائے ان کے ہمہ دم شباب کے اسباب پیدا کرنے چاہیئے تاکہ ہر نئی آنے والی نسل کو سچائیاں تلاش کرنے میں معاونت کا احساس ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پہلے ہی سے ان کے لیئے دوٹوک اور جامد قسم کے طریقِ کار مہیا کر دیں اور وہ اس کی ملکیت سے باہر نکلتے ہوئے تامل کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

جوگندر پال

محترم پروفیسر جیلانی کامران صاحب

جناب عالی، آپکی تمام زندگی تنقیدی فلاسفی کے مطالعہ اور درس و تدریس سے عبارت ہے
آپ کا شمار ہمارے ملک کے اُن تخلیقی اور تنقیدی دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے
اپنے فن کے ذریعے جہاں انسانی فطرت کا وسیع تناظر میں مطالعہ پلیش کیا ہے وہاں ملی حوالے
سے اپنی انتقادی فلاسفی بھی بڑی کشادہ دلی سے اپنے قارئین تک پہنچائی ہے۔ یوں
بھی آپ کی نگاہ مشرق و مغرب کے ادبِ عالیہ پر بڑی گہری اور عمیق ہے اس لیے میں
بجا طور پر امید کرتا ہوں کہ آپ یقیناً میرے سوال کا جواب جامع اور اس کے سیاق و
سباق میں دیں گے۔

غیاث چودھری

آپ نے جس موضوع کے بارے میں مجھے کچھ کہنے کے لیے کہا ہے وہ ایک بہت
وسیع فکری مسئلہ ہے سچ اور جھوٹ کے بارے میں یہ بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان دونوں
کی بے شمار صورتیں ہیں اور انسانی کردار کے بے شمار ایسے مظاہر ہیں جن میں سچ
اور جھوٹ کی پہچان آسان بھی ہے اور بعض حالات میں بے حد دشوار بھی ہے۔
جہاں تک میں نے اس موضوع کو سمجھا ہے یہ ہمارے چال چلن پر حاوی دکھائی دیتا
ہے اور غالباً اس سے ہمارے معاشرتی عمل کے اُس پہلو کی نشاندہی بھی ہوتی ہے
جسے ہم عام طور پر منافقت کے نام سے پکارتے ہیں سچ کی صورت بسا اوقات اور
ہوتی ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے اس کی صورت مختلف ہوتی ہے اس طرح ایک ہی
انسانی کردار میں ہمیں دو جہتیں ظاہر ہوتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں سچ کو کبھی کسی نے
جھٹلایا نہیں اور نہ ہی انسانی تاریخ میں ایسا کوئی دور آیا ہے جب کسی نے کہا ہو کہ
ہمیں اس اصول کی ضرورت نہیں ہے۔ سچ کی اصولی طور پر ہمہ گیر عملداری رہی ہے
اس وقت بھی ہم اور ہمارا معاشرہ سچ ہی کی قدر کو اور سچ ہی کی انسانی جہت کو بہت بڑی

اہمیت دیتے ہیں اور جھوٹ کو یقیناً کسی طرح بھی قابل اعتنا نہیں گردانتے سچ کے بارے میں بے شمار داناؤں نے اس کی تلقین کی ہے اور سچ کو قوموں نے قبول کیا ہے لیکن اس کے باوجود انسان ہمیشہ تضاد کا شکار رہا ہے

میں سمجھتا ہوں کہ سچ ایک معیاری قدر کے طور پر انسانی تاریخ میں برابر موجود رہا ہے اور اس انسانی اور اخلاقی معیار تک پہنچنے کے لیئے انسانی فطرت نے ہر زمانے میں سنجیدگی سے کوششیں کی ہیں لیکن انسانی کردار میں سچ کو بروئے کار لانے میں انسانی فطرت کو جزوی کامیابی ہوئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان اس معیار کو پانے میں بہت پیچھے کہیں رک جاتا ہے لیکن اس جزوی ناکامی کے باوجود سچ ایک اصول کے طور پر برابر موجود رہتا ہے تاہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سچ اصولی طور پر موجود ہے اور ایسے انسانی رسم و سلوک میں قبول کیا گیا ہے تو انسانی سرشت کی جزوی کامیابی (یا ناکامی) کی بنیادی وجوہات کیا ہیں ؟

اس کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ ماحول اور کرتوں کے باہمی رابطے کا تصادم ہے جس کی بنا پر سچ انفرادی زندگی میں انسانی سرشت کی پوری طرح تکمیل نہیں کر سکتا اور اگر کسی ماحول میں محاذ آرائی اور مقابلہ آرائی کا منظر موجود ہو ۔ تو اس ماحول میں سچ کا اضافی صورت اختیار کر لینا ناگزیر دکھائی دیتا ہے ۔ تاہم جب سچ کی عمل پذیری کرتوں کے سلسلے میں کارفرما ہوتی ہے تو سچ کا اضافی ہو جانا منطقی نظر آتا ہے ۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ خواہ سچ کی تعبیریں متعدد ہوں ۔ کوئی بھی معاشرہ سچ کے مطابق ہونے سے انکار نہیں کرتا ۔ اس لیے سچ کی دو واضح صورتیں نظر آتی ہیں ۔ ایک کا تعلق انفرادی زندگی سے دکھائی دیتا ہے اور دوسری کا رشتہ اجتماعی نظر آتا ہے اس لیئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انفرادی زندگی میں سچ کی صورت اضافی ہے تو کیا اجتماعی زندگی میں یہ اضافی صورت اختیار نہیں کر سکتا ۔ یہ کیفیت قوموں کے لیئے اخلاقی بحران پیدا کرتی ہے اور لیڈرشپ کے آزمائش کے دوراہے تشکیل کرتی ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ انفرادی سرشت ہی اجتماعی سرشت کی بنیاد ہے ۔ اور اگر انفرادی سرشت سچ کو اپنے

ذاتی مفادات سے بالاتر کر دانتی ہے تو اجتماعی سطح پر بھی اس کے چناؤ کی صورت قابل اعتماد ہونا ممکن ہے۔

تاہم اگر اس ساری کیفیت کا جائزہ لیا جائے کہ سچ کو تو سب تسلیم کرتے ہیں لیکن عملداری جھوٹ کی دکھائی دیتی ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ حقیقت میں سب ہی سچ کا ساتھ دیتے ہیں اور جھوٹ کی عملداری محض فریب نظر ہے سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی شخص جھوٹ کا ساتھ نہیں دیتا۔ البتہ جو فعل صادر ہوتا ہے اس پر جھوٹ اور سچ کی درجہ بندی کا اطلاق محسوس ہوتا ہے حقیقت میں انسانی افعال کے ذریعے سچ اور جھوٹ کے مابین حد فاصل ظاہر ہوتی ہے انسانی افعال کے عقب میں سچ اور صرف سچ ہی کارفرما دکھائی دیتا ہے یہ امر غالباً ایسا ہے جس کے ساتھ اختلاف ممکن ہے تاہم جب انسانی فعل کی وساطت سے سچ اور جھوٹ کے درمیان پہچان مشکل ہو جاتی ہے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض انسانی فعل اس لیے سچ کو چھپا دیتے ہیں کہ معاشرے کا خوف اُن کو اصل سچائی بیان کرنے سے روک دیتا ہے اس لیے جھوٹ کی عملداری ہمیشہ وہاں دکھائی دیتی ہے جہاں خوف کا دور دورہ شدید تر ہوتا ہے بچوں کی نفسیات میں بھی یہی خوف کا عنصر ایسا ہے جو بچوں کو جھوٹ کی ترغیب دے کر سچ سے دور تر کر دیتا ہے انسان ماحول سے خوف کو منہا کرنے سے بادی النظر میں جو جھوٹ کا دور دورہ نظر آتا ہے اسے کم سے کم تر کیا جا سکتا ہے۔

اسی ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جھوٹ کی عملداری فریب نظر ہے کیوں کہ کوئی شخص بھی جھوٹ کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جھوٹ انسانی رشتوں اور رابطوں میں پردہ حائل کرتا ہے اور انسانی زندگی میں غیریت کو رواج دیتا ہے اس لیے اگر یہ مفروضہ مان بھی لیا جائے کہ زندگی میں عملداری جھوٹ کی ہے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسا معاشرہ غیریت اور باہمی عداوتوں اور دوریوں کا معاشرہ بن چکا ہے۔ ایسے معاشرے کبھی قائم نہیں رہ سکتے۔ اور اگر کوئی معاشرہ برابر موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں جھوٹ کا دور دورہ نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر سچ

بولتا ہے ۔ لیکن معاشرے میں انفرادی سرشت کا سچ جزدی طور پر جھوٹ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ ایسا کیوں ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ ہر انسانی قدر اپنے معروضی اظہار کے لیئے ایک خاص ماحول کا تقاضہ کرتی ہے سچائی بھی اس اعتبار سے ایک بنیادی انسانی قدر ہے اور سچ کا معروض میں اظہار اس ماحول کے بغیر تکمیل پزیر نہیں ہو سکتا جس ماحول اور فضا میں یہ قدر (سچائی) نشو و نما پا سکتی ہے اور پاتی ہے ۔ انسان ایک لمبے عرصے سے جس ماحول سے آشنا ہے وہ انسانوں کو گروہوں طبقوں اور نسبی رشتوں میں تقسیم کرتا ہے اور ایسا طریق کار انسان کو کثرتوں سے روشناس بھی کرتا ہے اور کثرتوں کی منطق باہمی آویزش سے رونما ہوتی ہے ۔ ایسے ماحول نے خوف کو ایک غیر قدرتی حجاب کے طور پر انسانی عادات، رویوں اور طرز زیست میں پھیلا رکھا ہے انسان کا انسان پر ظلم، اور انسانوں کا استحصال، سزاؤں کا تصور، اور انسانی انا کی پائمالی ایسے مختلف مظاہر ہیں جو انسانی ماحول کے نافیہ مزاج کی نشاندہی کرتے ہیں اس لیے ایسے ماحول میں سے خوف کو مٹانے، کم سے کم کرنے اور اس کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی برابری کے تصور کو اپنایا جائے، انسانوں کے مابین ان کے ایک ہونے کی صورت کو مستحکم کیا جائے اور اُن کو آزاد ہونے کا پختہ احساس دلایا جائے یہ تینوں تقاضے مساوات، اخوت اور حریت کے اصولوں سے اپنا معاشرتی اسلوب اخذ کر سکتے ہیں ۔ جو معاشرہ ان رویوں سے تشکیل پاتا ہے اس میں ایک نئی انسانی شخصیت کا ظہور ممکن ہوتا ہے ۔ مساوات، اخوت اور حریت کے دستیاب ہونے سے انسانی تکریم و احترام کے رویئے ظاہر ہو سکتے ہیں اس لیئے اگر انسانی تکریم و احترام کے رویئے کو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک بروئے کار لایا جائے تو نہ صرف والدین اور اولاد کے تعلقات، بھائیوں اور بہنوں کے تعلقات، گھرانے کے اندر افراد کے تعلقات، معاشرے میں افراد کے باہمی تعلقات، اور قومی زندگی میں اجتماعی تعلقات، سب کی صورت بدل سکتی ہے اور خوف کے بغیر ایک نئی انسانی صورتحال کا آشکار ہونا

بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ اور خوف کی جگہ اُنس اور محبت، اعتماد اور عزتِ نفس کی فضا قائم ہو سکتی ہے سچائی کی قدر دراصل ایسے ہی انسانی ماحول کا تقاضا کرتی ہے اور ایسے انسانی ماحول میں جھوٹ کی عملداری قائم نہیں رہ سکتی، کیونکہ جھوٹ خوف سے پیدا ہوتا ہے اور خوف سچ کو مصلحتوں کی بنا پر ڈھانپ دیتا ہے۔ ہمارے مذہبی کلچر میں کفر کو باطل شاید اسی لیئے قرار دیا گیا ہے کہ کفر سچ کو ڈھانپتا ہے اور اسے ظاہر ہونے سے روک دیتا ہے۔

تاہم اس ضمن میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جس معاشرے میں بظاہر جھوٹ کی عملداری عام دکھائی دے اور سچ کی تلقین کا تذکرہ بھی ہو۔ وہاں ایسی کیفیت اس نظام کی نشاندہی کرتی ہے جو اپنے طور پر فرسودہ ہو چکا ہوتا ہے وگرنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ سچ کی تلقین بھی ہو اور جھوٹ کی عملداری بھی قائم رہے ایسی صورت میں یہ نظام ہی کی بربریت ہے جو خوف کو پیدا کرتی ہے اور سچ کو ظاہر ہونے سے روک دیتی ہے اگر ایسے نظام کی معروضی طور پر نئی تشکیل نہیں کی جاتی تو یہ ساری صورتحال انسان کی تباہی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

اس پھیلے ہوئے منظر میں ہر چند کہ سچائی کی قدر آفاقی نوعیت کی حامل بھی ہے اور سچ کو انسانی کردار میں راسخ کرنے کا عمل بھی معاشرتی کیفیت سے تعلق رکھتا ہے اور جھوٹ کی عملداری کے ماحول میں ان کے باہمی رشتوں سے انسانی رشتوں کا سلسلہ بھی پیدا ہوتا ہے تاہم بنیادی امر یہ ہے کہ سچ کا اصل تعلق فرد واحد ہی کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔

سچائی کی قدر کو انسانی کردار میں ڈھالنے کی ذمہ داری بہر صورت فرد واحد کی ہے کہ وہ جھوٹ کی عملداری میں سچ کو کس طرح اور کس حد تک راسخ کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اور کوئی بھی فرد واحد اس وقت تک سچ کی حکمرانی کی حمایت نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ ہر اعتبار سے آزاد نہ ہو اور اس کی زندگی کو کسی طرح برباد کیئے جانے کی کوئی روش موجود نہ ہو۔ جھوٹ کی عملداری دراصل انسانی سرشت کو مغلوب کرنے

سے بیدار ہوتی ہے اور انسان کو اس کی انسانیت سے اور انسانی وقار سے محروم کرتی ہے اس لیے جس معاشرے میں جھوٹ کی عملداری کا سکّہ رائج ہو۔ وہ معاشرہ انسان کی بنیادی آزادیوں کو تلف کرنے کے درپے رہتا ہے کیونکہ سچائی ہی اصل آزادی ہے سچ کا اظہار اس آزادی سے اخذ ہوتا ہوا انسانی حق ہے اور جھوٹ ان دونوں کی نفی کرنے کا نام ہے اس لیے جھوٹ کے تسلط سے انسان کی غلامی رونما ہوتی ہے اور جہاں جس قدر کم در سچائی کا تذکرہ ہو گا وہ دنیا اور وہ معاشرہ اسی تناسب سے غیر انسانی، پست اور ہلاکت خیز ہو گا۔

جیلانی کامران

محترم صفدر میر صاحب

جناب عالی، آپ برصغیر کے ان دانشوروں میں سے ایک ہیں جن کے فکر کی گہرائی اور استقامت ضرب المثل بن چکی ہے آپ شاعری، تنقید اور ڈرامے میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ آپ نے وطن عزیز کی کئی نسلوں کی ذہنی اور فکری آبیاری کی ہے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ادبی مؤرخ آپ کی ہمہ گیر نظریاتی اقامت سے صرف نظر نہیں کر سکے گا۔ میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ میرے سوال کا جواب اپنے طویل مطالعے، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں ارزانی فرما کر مجھے شکر گذار ہونے کا موقع فراہم کریں۔

غیاث چوہدری

غیاث چوہدری صاحب آپ کا سوال ایک بنیادی اور بڑا اہم سوال ہے جس کا جواب دینے میں حکمار نے اپنی طویل عمریں صرف کی ہیں اور لاکھوں صفحات کالے کیئے ہیں اور اگر ہم اس حد تک نہ جائیں جس حد تک حکمار نے کوشش کی ہے تو ہم ایک حدیث سے شروع کر سکتے ہیں جو کہ نبیٔ کریم صلعم سے منسوب ہے اور وہ حدیث یہ ہے "اے خدا مجھے چیزیں اس طرح سے دکھا جس طرح وہ حقیقت میں ہیں"۔ اور یہ ایک خاص الخاص بندے کا نقطہ نظر ہے کہ وہ اپنے زمانے کا بہت ہی بڑا بلکہ سب سے بڑا عرب اور پیغمبر ہونے کے باوجود حقائق کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہے کہ حقائق جیسے ہیں ویسے نظر نہیں آتے۔ لہٰذا ہمیں اس چیز سے

شروع کرنا ہے کہ حقائق ظاہر ہوتے ہوئے بھی ظاہر نہیں ہیں اس کی بنیادی وجہ کی طرف مولانا روم نے اپنی ایک مثنوی میں اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے
این جہاں جنگ است چوں کل بنگری ، ذرہ با ذرہ چوں دین با کافری، اس دنیا میں جو چیز بھی ہے اس کی ضد موجود ہے کیونکہ یہ انسداد کی دنیا ہے اور جو چیز ضد کے بغیر ہے وہ خدا کی ذات ہے باقی تمام دنیا انسداد سے اور جنگ سے بھری ہوئی ہے یعنی اگر آپ اس دنیا کو اپنی کنیت میں دیکھیں گے تو یہ دنیا جنگ ہی جنگ ہے ہر ذرہ دوسرے ذرے کے ساتھ اور دین کفر کے ساتھ نبرد آزما ہے تو دین اور کفر کی کیا حقیقت ہے! اس کی حقیقت سچ اور جھوٹ کی ہے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں یا زمانۂ بلیش میں ہر ایک شخص اپنی بساط کے مطابق، اپنے علاقے کے مطابق اور اپنی سطح کے مطابق نیکی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے صحیح زندگی گذارنا چاہتا ہے اور صحیح زندگی کی بنیاد سچائی ہے یعنی حقائق جیسے ہیں ویسے ہی نظر آئیں اور انہی کی بنیاد پر زندگی آگے بڑھے لیکن ہر شخص کی بصارت اور بصیرت ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ متضاد ہے۔ اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے ہم اس حقیقت سے جان نہیں چھڑا سکتے کہ قومیں ہوں یا افراد، سب اپنے اپنے مفاد کے لیئے کام کرتے ہیں صورت حال ایسی ہے کہ ہر کسی کو اپنا مفاد دیکھنا پڑتا ہے اس کے لیئے کام کرنا پڑتا ہے۔

قومی زندگی ایسی ہے کہ قوموں کو اپنے اپنے مفاد پر قائم کردہ سیاست چلانا پڑتی ہے یہی حال طبقات کا ہے اپنے ملک میں کئی طبقات ہیں بڑے طبقات بھی ہیں چھوٹے بھی ہیں زمیندار بھی ہیں مزارعین بھی ہیں سرمایہ دار بھی ہیں مزدور بھی ہیں یہ سب کے سب اپنے اپنے مفاد کے لیئے کام کرتے ہیں مزدور کارخانے میں اپنے مفاد کے لیئے جاتا ہے مالک کے مفاد کے لیئے نہیں جاتا اور سرمایہ دار اگر اس کو کام دیتا ہے تو وہ اس لیئے نہیں دیتا کہ وہ اس پر مہربانی کرتا ہے بلکہ اس لیئے کہ اس نے مزدور کی محنت سے اپنا نفع کمانا ہے تو یہ جو دنیا میں آپس

کے تعلقات میں۔ چاہے فرد کے فرد کے ساتھ ہوں چاہے طبقے کے طبقے کے ساتھ ہوں
گروہ کے گروہ کے ساتھ ہوں یا قوم کے قوم کے ساتھ ہوں یہ ذاتی مفاد پر مبنی ہوتے
ہیں لیکن ذاتی مفاد تو ایک دوسرے کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ ایک کا مفاد دوسرے
کے استحصال سے عبارت ہوتا ہے جیسے سرمایہ دار کہتا ہے کہ مزدور یونین بنا کر
میرا استحصال کرنا چاہتا ہے تو اپنے ذاتی مفاد کے لیئے کام کرتے ہوئے حقائق
کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے ایک آدمی اس کو سچ، اور دوسرا اس کو جھوٹ
سمجھتا ہے یہ جو ایک خیال ہے کہ لوگ ایک معاہدہ کر کے چلتے ہیں اور آگے چل کر
اس سے انحراف کرتے ہیں تو ایسا نہیں ہے دراصل بات یہ ہے کہ وہ بنیاد جس
کی وجہ سے ایک دوسرے کا مفاد ٹکرا جاتا ہے وہ بنیاد غلط ہے یہاں دو باتیں ہیں
پہلی یہ جو کہ ایک بنیادی بات ہے خاص طور پر پاکستان کے حالات کے بارے میں
کہ لاکھوں ایکڑ زمین صرف ایک شخص یا ایک خاندان کے قبضے میں ہے اور لاکھوں
انسان جو اس زمین پر کام کرتے ہیں ان کا اس زمین پر کوئی حق نہیں وہ صرف وہاں سے
زندہ رہنے کے لیئے روزی کما سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس زمین کے مالک کی مقرر کردہ
شرائط پر پورے اتریں تو یہ ہے وہ بنیاد جو غلط ہے کیونکہ نہ تو اس کا اسلامی نقطۂ نظر
سے کوئی جواز ہے اور نہ ہی اخلاقی طور پر اس کا کوئی جواز ہے دوسری بات یہ ہے
کہ جو سرمایہ داری نظام ہے جو کہ تقریباً چار سو سال سے وجود میں آیا ہے اس سے
پہلے لوگ محنت مزدوری کرتے تھے یا جو اُن کی مصنوعات ہوتی تھیں ان کو وہ بازار میں
جا کر بیچتے تھے لیکن اب وہ طریق کار نہیں ہے اب صورتحال یہ ہے کہ ایک آدمی
بینک سے یا کسی اور ذریعے سے کروڑوں روپے کی مالیت سے فیکٹری قائم کرتا
ہے اور کروڑوں روپے کی اس میں مشینیں لگاتا ہے جن پر وہ مزدوروں کو ملازم رکھ
کر ان سے کام لیتا ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو بھی چیز تیار ہو کر مارکیٹ میں
آتی ہے وہ مزدور کی محنت کے بغیر تیار نہیں ہوتی، تو اصل حقیقت یہ ہے کہ
کارخانے میں مزدور کی مزدوری سے زاید جو اس کا حق بنتا ہے وہ اسے نہیں

ملتا بلکہ وہ سرمایہ دار لے جاتا ہے یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ یہ ایک ایسی جنس ہے جس کی پوری قیمت ادا نہیں کی گئی اور اگر پوری قیمت ادا نہ کی جائے تو وہ خیانت ہوتی ہے جو کہ اسلام میں جائز نہیں سرمایہ دار مزدور کی محنت پر جو منافع کماتا ہے وہ سود ہوتا ہے جو کہ جائز نہیں تو یہ دونوں بڑے بڑے factors جاگیرداری اور سرمایہ داری ہمارے نقطۂ نظر سے اور objective scienti-fic نقطۂ نظر سے جھوٹ پر مبنی ہیں یہ سچائی پر مبنی نہیں ہیں اس جھوٹ کو ختم ہونا چاہیئے لیکن پاکستان کی ساری سیاسی community کی اکثریت جاگیرداری کو بھی جائز سمجھتی ہے چاہے ایک آدمی کے قبضے میں لاکھوں ایکڑ اراضی جو اس نے کسی بھی طریقے سے حاصل کی ہو، چاہے اس نے ملک و قوم کے ساتھ غداری کرنے کے صلے میں حاصل کی ہو وہ زمین اس سے واپس لی نہیں جاسکتی، اور یہ بات ایک بڑی سیاسی پارٹی کا بڑا لیڈر کہہ گیا ہے۔ اسی طرح سرمائے کے بارے میں ہے کہ سرمایہ کسی بھی طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اس کے مالک کو کوئی نہیں پوچھتا اور اب تو سرمایہ دار سرمایہ اپنے پاس رکھتا ہی نہیں وہ تو بنک سے کروڑوں روپیہ لیتا ہے اور فیکٹری میں لگا دیتا ہے وہیں سے کماتا ہے اور سرمایہ دار بنتا ہے یا فرض کریں وہ سرمایہ دار سرمایہ گھر سے لے کر آیا ہے تو کم از کم کھنگالنا چاہیئے کہ وہ سرمایہ کہاں سے آیا ہے۔ اس ملک کے سرمایہ دار جو شروع سے ہی سرمایہ داری کرتے چلے آرہے ہیں اگر ان کے ذرائع کا پتہ لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ سرمایہ چوری، ڈکیتی اور خیانت کے ذریعے سے حاصل کیا گیا ہو گا خدا ان لوگوں کو سچائی پر چلنے کی توفیق دے حقیقت یہی ہے کہ یہ لوگ جھوٹ ہی کو سچائی خیال کرتے ہیں اور سچائی کو جھوٹ کے طور پر treat کرتے ہیں ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ سچائی ان کا مطمعِ نظر نہیں ہے بلکہ ذاتی مفاد ہے اور جہاں ذاتی مفاد آتا ہے وہاں سچ اور جھوٹ کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ سچ اور جھوٹ کے متعلق لاپرواہی کی یہ بنیادی وجہ ہے یہ سلسلہ کب تک چلے گا اور اسے کب ختم

کیا جائے گا۔ اس بارے میں اس لیئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بنیادی طور پر انسان ضعیف البنیان ہے اس کی جڑیں کمزور ہیں اگر انسان چاہے تو فرشتوں سے اوپر نکل سکتا ہے اور اگر نہ چاہے تو وہ اسفل السافلین میں شمار ہو گا اصل حقیقت یہی ہے کہ انسان کو جو انتخاب کی قوت دی گئی ہے اس کے مطابق اس نے عمل کرنا ہوتا ہے اس لیئے افسوس کی بات یہ ہے کہ انسان اکثر اوقات سچائی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ جھوٹ پر ہی ساری زندگی چلتا رہتا ہے۔ بنیادی بات وہی ہے کہ خدا ہمیں چیزوں کو ان کی حقیقت کے مطابق دیکھنے کی توفیق عطا کرے تاکہ ہم اپنے اعمال کے لیئے صحیح بنیاد کا انتخاب کر سکیں کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔

محمد صفدر میر

محترم ڈاکٹر طاہر القادری صاحب

جناب عالی، آپ ہمارے ان چیدہ مذہبی علماء میں سے ہیں جن کی گھریلو تربیت بھی نہایت مثالی رہی ہے جن کا اکڈمیک کیریر بھی نہایت ہی قابل رشک رہا ہے۔ اور جن کے انقلابی افکار اور رویے کی اپنی ایک دلآویز تاریخ بھی ہے آپ کے والدِ گرامی قدر علامہ ڈاکٹر فرید الدین قادری صاحب کی روحانی پرداخت، حضرت شیخ طاہر علاؤ الدین الگیلانی صاحب کا فیضانِ بیعت، محاذ حریت کا وجود میں آنا، مرکزی ادارہ منہاج القرآن کا قیام، تاسیس انقلاب کانفرنس کا ولولہ انگیز انعقاد، اور وسیع پیمانے پر سیاسی کارکردگی کے لیئے عوامی تحریکِ پاکستان کا اعلان، یہ سب عوامل اس زندہ حقیقت کے شواہد ہیں۔ کہ طاغوتی اور استحصالی طاقتوں کے خلاف آپ کے جہاد کا منصوبہ کوئی اضطراری فعل نہیں ہے۔ بلکہ سالہا سال کے غور و فکر کا قدرتی اور ارتقائی نتیجہ ہے ان تمام حقائق کی روشنی میں میں اپنے ایک پیچیدہ اور پریشان کن سوال کے لیئے آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں تاکہ آپ کا معقول اور مدلل جواب میرے علاوہ اور بھی لاتعداد تشنگان علم کی سیرابی کا باعث بنے۔

غیاث چودھری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

محترم غیاث چودھری صاحب؛ آپ کا سوال میں نے سن لیا ہے اور خط کی صورت میں میں نے پڑھ بھی لیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرے کی نظر میں سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں کم نظر آتی ہے اور ظاہراً ہر کوئی سچ کا حامی اور دعویدار بھی نظر آتا ہے پہلی بات یہ ہے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے اس کے تعین میں عموماً لوگ مغالطے کا شکار رہیں۔ اور نمبر ۲ جب تعین ہو جائے

کہ سچ یہ ہے تو پھر اس سچ پر لوگ سچ کی عملداری چاہتے ہیں اور سچ کا دعوہ کرتے ہیں اور اس کی حمائت کی بات کرتے ہیں وہ اپنی عملی زندگی میں اس سچ کا نمونہ پیش نہیں کرتے۔ یعنی سچ سنائی تو دیتا ہے لیکن دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیئے سچ کی عملداری نہیں ہوتی۔ یہ دو پہلو ایسے ہیں جن پر میں بحث کا اکتفا کروں گا مگر صورتیں اور بھی بہت ساری ہیں لیکن اگر brief بات بھی ہو جائے تو سمجھ میں آجائے گی اور آپ کا مدعا بھی پورا ہو جائے گا۔

پہلی بات تو سچ کا یقین ہے۔ صورت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے سچ کا مفہوم اپنے طور پر گھڑ لیا ہے اور اپنے غلط مفادات جو کہ خاندانی، گروہی، اپنے اندر چھپی ہوئی نفسانیت، انانیت، جھوٹا پندار، بھرم اور ایسی تمام نام نہاد رسومات یہ سب جھوٹ کے سبب ہیں جن کو قائم رکھتے ہوئے ہم اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لیئے سچ کی بات کرتے ہیں۔ جب کہ سچ ان تمام چیزوں کی ابتدا ہی سے نفی کر رہا ہے۔ اب سچ کا معیار جو اسلام نے پیش کیا ہے اس کا ایک نمونہ ہے۔ لاالٰہ الااللہ، تو سچ تب بنتا ہے جب پہلے باطل کی نفی ہو اور پھر حق کا اثبات ہو تو اس کا نام سچ ہے۔ وگرنہ محض سچ کی تصدیق کروانا مقصود ہوتا تو باطل کی نفی کروائے بغیر کہا جاتا کہ یہ سچ ہے اس کو مانو تو اس کا نام سچ کی عملداری ہو جاتا مگر اس کو سچ کی عملداری اسلام نے نہیں کہا۔ اسلام کہتا ہے کہ جب تک اپنے قول و فعل سے، اپنے قلب و نظر سے، اپنے ظاہر و باطن سے، اپنے سیرت و کردار سے ہر قسم کے جھوٹ کی، ہر قسم کے دجل و فریب کی، ہر قسم کے دھوکے کی، ہر کذب کی، انانیت کی، نفسانیت کی، ان تمام چیزوں کی نفی نہ کر دی جائے جو حق و باطل کی آمیزش کا باعث بنتی ہیں۔ تب تک سچ کا دعویٰ، سچ کی حمائت، سچ کا اعلان اور سچ کا اثبات ممکن ہی نہیں کیونکہ ان سب چیزوں کی موجودگی میں سچ سرے سے بنتا ہی نہیں۔ علامہ اقبال نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے

ع شرکتِ میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

لیکن ہم ایک طرف تو سچ بولے جا رہے ہیں اور دوسری طرف جھوٹ اور باطل کو accomodate کرتے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ کہتے جاتے ہیں کہ ہم نے سچ بولا ہم نے سچ پر عمل کیا لیکن مثبت نتائج پیدا نہ ہوئے بلکہ نقصان ہوا۔ دراصل ہم نے یہ سراسر غلط نتیجہ اخذ کر لیا کہ سچ کے ساتھ تو survive ہی نہیں کیا جا سکتا سچ کے ساتھ تو زندہ ہی نہیں رہا جا سکتا۔ حالانکہ سچ کے ساتھ پہلے بھی زندہ رہا جا سکتا تھا۔ سچ کے ساتھ آج بھی زندہ رہا جا سکتا ہے اور سچ کے ساتھ لاکھوں کروڑوں سال بعد بھی زندہ رہا جا سکے گا۔ سچ خود زندگی ہے اور زندگی بخش ہے۔ حیات بخش سچ تو زندہ رکھنے والا ہے اب ہم نے جو یہ گمان کر لیا ہے کہ سچ پر عمل کرنے سے نتیجہ پیدا نہیں ہوتا دھچکا لگتا ہے نقصان ہوتا ہے دراصل بات یہ ہوتی ہے کہ جس کو ہم سچ کہتے ہیں وہ سچ نہیں ہوتا اس لیئے اس پر عمل کرنے سے سچ کی عملداری بھی کم ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں ہم دیکھتے ہیں جھوٹ پر عمل کرنے سے نتائج بھی برآمد ہوئے تقویت ملی عزت ملی اور چونکہ اس میں Results نظر آتے ہیں اس لیئے جھوٹ کی عملداری بڑھتی چلی جاتی ہے اور سچ کی عملداری کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب اگر ہم اس سوال کی روشنی میں یہ تلاش کرنا چاہیں کہ اس کی Reason کیا ہے تو وہ یہ ہے کہ سچ کے مفہوم کے تعین میں غلطی ہے یعنی ہم سارے مفادات اور باطل کو ایک طرف چلا رہے ہیں اور سچ کو دین کا نام دے کر چلا رہے ہیں مطلب یہ کہ سچ اور جھوٹ کی آمیزش چل رہی ہے سچ سچ نہیں رہا۔ اگر سچ نکھرا ہوا سچ ہو، ستھرا سچ ہو بغیر آمیزش ہو اور مفادات قربان ہوتے ہوں۔ قربان کر دیئے جائیں، اغراض قربان ہوئی ہوں، قربان کر دی جائیں حرص و ہوس کے بت ٹوٹتے ہوں تو توڑ دیئے جائیں اور سچ کو سچائی کے ساتھ اپنایا جائے اور پھر کسی بھی قیمت پر سمجھوتہ نہ کیا جائے withdraw نہ کیا جائے۔ ایک بار نقصان ہو دوسری بار ہو تیسری بار ہو لیکن عمل جاری رکھا جائے۔ کیونکہ یہ آزمائش ہوتی ہے تو پھر بالآخر فتح سچ ہی کی ہوتی ہے اور نتائج سچ ہی کے

پیدا ہوتے ہیں۔ اور باطل کو بالآخر شکست ہوتی ہے۔ سو اگر ہم جھوٹ کے ساتھ سمجھوتے کے بغیر ستھرے اور نکھرے ہوئے سچ پر قائم رہیں تو پھر سچ کے نتائج پیدا ہوں گے اور جب اپنی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ ہو گا تو سچ کی عملداری بھی خود بخود شروع ہو جائے گی۔

قرآن مجید یہاں ایک تصور دیتا ہے ارشاد فرمایا گیا کہ۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ۔

کہ تم پست ہمت نہ ہو گھبراؤ نہیں، غمزدہ نہ ہو حوصلہ نہ ہارو حق اور سچ پر عمل پیرا ہو کر جدوجہد جاری رکھو باطل اور جھوٹ سے سمجھوتہ نہ کرو۔

لاالہ الا اللہ، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہر باطل کی نفی کر دی پھر الا اللہ کہہ کر اللہ کا اقبال کیا گویا باطل سے سمجھوتہ نہ کرو اور حق پہ ڈٹے رہو۔ اگر اس شرط کے ساتھ چلو گے تو سچ پر عمل ہو گا۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ پھر تمھیں کامیابی ملے گی تمہارے حق میں نتائج پیدا ہوں گے۔ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ۔ پھر اللہ تمہارے ساتھ ہو گا اگر تم سچ کے ساتھ پوری سچائی سے رہو گے اور باطل اور جھوٹ کو ٹھکرا دو گے۔ ان لالچوں اور حرص و ہوس کے باوجود ٹھکرا دو گے اور سچ پر قائم رہو گے۔ تو پھر اللہ تمہارے ساتھ ہو جائے گا بس یہ ایک سٹیج ہوتی ہے جس پر اللہ بندے کو آزماتا ہے۔ یعنی ایک میدان میں بندے کو ڈال کر سچ بھی باطل بھی دے دیتا ہے۔ باطل سے پیدا ہونے والے نتائج ذرا عاجل ہوتے ہیں اور جلدی ملتے ہیں تو جلدی ملنے والے نتائج کو انسان نگاہ میں رکھ لیتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ یہ محض عارضی ہیں ہنگامی ہیں اور بالآخر یہ ختم ہو جائیں گے اور جھوٹ کے راستے میں جو عزت نظر آ رہی ہے وہ بے عزتی میں بدل جائے گی کیونکہ پیچھے چھپی ہوئی بے عزتی نظر نہیں آتی اور سامنے جھوٹی عزت نظر آتی ہے۔ ایک طرف شیطان کے ذریعے یہ جال پھیلا دیا جاتا ہے دوسری طرف سچ اپنے ساتھ مصائب آلام اور پریشانیاں

اور مشکلات لے کر آتا ہے اور جھوٹ اپنے ساتھ آسانیاں، مفادات، حرص و لالچ کو لے کر آتا ہے یہ ایک بڑی بنیادی بات ہے۔ اب جب دونوں چیزیں انسان کے سامنے رکھ دی جاتی ہیں تو انسان کے اندر ایک حرص ہے نفس ہے جو اس کو یہ کہتا ہے۔ کہ اس طرف جلد نتیجہ نظر آرہا ہے۔ اس لیئے اس طرف جاؤ کیونکہ اُدھر تکالیف نہیں ہیں آرام ہیں۔ اور انسان اسی طرف لپک جاتا ہے اور گمان یہ کر لیتا ہے کہ سچ سے مثبت نتائج پیدا نہیں ہوتے پھر یہ ہے کہ ایک طبقہ تو ایسا ہوتا ہے لوگوں کا جو سچ کی طرف تو چلتا ہی نہیں اور جھوٹ کی آرائش و آسائش کو دیکھ کر شروع ہی سے اُدھر چلا جاتا ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دو چار قدم سچ کی طرف چلتے تو ہیں لیکن وہ سچ کی طرف سچ کی خاطر نہیں چلتے بلکہ مفادات کی خاطر چلتے ہیں اس طرح اگر کوئی اپنے مفادات کی خاطر چند قدم سچ کے ساتھ چلا بھی تو دراصل وہ سچ کی طرف نہیں بلکہ جھوٹ ہی کی طرف چلا۔ دیکھنے میں گو لگتا ہے کہ سچ کی طرف چل رہا ہے لیکن اصل میں تو جھوٹ ہی کی طرف چل رہا ہے کیونکہ اس کے مدنظر اس کے مقاصد و اغراض ہیں۔ سچ کی طرف تو چلنے کا معنیٰ یہ ہے کہ سچ کی طرف سچ کی خاطر چلے نہ کہ مفادات کی خاطر۔ اس سے ہی تو علمداری رک جاتی ہے سو قرآن کہتا ہے کہ جھوٹ کو مسترد کر کے چلو۔ آنحضور صلعم نے پتھر بھی کھائے، صعوبتیں بھی جھیلیں، الزام بھی لگے، تہمتیں بھی لگیں، فاقے بھی آئے، رکاوٹیں بھی ہوئیں حملے بھی ہوئے۔ سچ کی راہ پر چلتے ہوئے یہ سارا کچھ ہوا۔ مگر جھوٹ سے سمجھوتہ نہیں ہوا۔ جھوٹ نے سرداری بھی offer کی۔ ملک کی بادشاہت بھی offer کی، رشتے بھی offer کیئے۔ مال و دولت بھی offer کی۔ مگر ہر چیز مسترد کر دی اور فرمایا اگر میرے ایک ہاتھ پہ چاند اور دوسرے پہ سورج بھی رکھ دو تب بھی جھوٹ کو قبول نہیں کروں گا اور سچ کو نہیں چھوڑوں گا۔ تو پھر اس طرح جب کوئی جھوٹ کو سچ کی خاطر مسترد کر کے چلے تو ایسے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے جھوٹ اس کے قدموں میں گر کر سر تسلیم خم کر لیتے ہیں پھر قرآن نے کہا کہ اس طرح کامیابی تمہاری ہو گی اور تب اللہ تعالیٰ ساتھ دیگا

ہم جھوٹ سے سمجھوتہ بھی کرتے ہیں اس سے ٹکر بھی نہیں لیتے اور اللہ کا ساتھ بھی مانگتے ہیں۔ امید بھی رکھتے ہیں جو کہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح قرآن مجید نے ایک اور جگہ کہا۔ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ٥ نہ گھبراؤ نہ پست ہمت ہو نہ حوصلہ ہارو کامیابی تم ہی کو ملے گی۔ اے اہل حق اے اہل سچ کامیابی تمہی کو ملے گی۔ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔ بشرطیکہ تم ایمان والے بن کے دکھاؤ یعنی سچ پر ثابت قدم رہو۔ ایک اور جگہ قرآن مجید میں فرمایا۔ وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ۔ قسم ہے زمانے کی انسان خسارے میں ہے اور نقصان میں ہے۔ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ٥ تو ایمان اور عمل صالح کا جو راستہ ہے یہ صبر چاہتا ہے اور صبر میں انتظار ہے صبر میں تکلیف ہے صبر میں مشکلات ہیں صبر میں آلام ہیں صبر میں اضطراب ہے ان تمام چیزوں پر ضبط کرنے ہی کو صبر کہتے ہیں اور یہ جو ہم کہتے ہیں دو سال ہو گئے پانچ سال ہو گئے لیکن ابھی تک وقت نہیں ٹلا تو یہ بے صبری ہے کیونکہ یہ جو صبر کا مرحلہ ہے خدا جانے دس سال ہے پچاس سال ہے یا سو سال گذر جائیں تو جو آدمی صبر کو لے کر اس طرح چلے گا۔ اس کا وقت بھی کٹ جائے گا اس کے حالات بھی بہتر ہوتے جائیں گے نتائج بھی بہتر پیدا ہوں گے تو ضرورت یہ ہے کہ اگر حق اور سچ والے سچائی پر چلیں تو صحیح نتائج برآمد ہوں گے۔

ڈاکٹر طاہر القادری

محترم ظہیر بابر صاحب

جنابِ عالی ۔ آپ ہمارے ملک کے ان سربرآوردہ دانشوروں میں سے ہیں جن کی خیال افروز آراء کا ہر طبقۂ فکر کے مفکرین نے ہمیشہ احترام کیا ہے ۔ آپ کا یہ مقام بے جواز نہیں ہے اس کے پیچھے آپ کا وسیع مطالعہ ، مستقل تدبر اور آفاقی مشاہدات کارفرما ہیں ۔ آپ نے اپنے افکار و خیالات کی بوقلمونی سے صحافت کو بھی نوازا ہے اور ہمارے افسانوی ادب کو بھی پرمایا بنایا ہے ۔ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بھی اپنی قیمتی آراء کا وقیع سیاسی تجزیہ ، لوگوں تک پہنچا کر ان کی فکری آبیاری کا اہم فریضہ بھی سرانجام دیا ہے ۔ آپ کی ادارتی کارکردگی کی بھی ایک خاص طویل تاریخ ہے جس پر کوئی بھی صحافتی ادارہ اس کے قارئین عمرانی آگہی کے حوالے سے بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں ۔

آپ کی افسانہ نگاری نے ہمیشہ اپنے پڑھنے والے کو اپنے کرداروں کے توسط سے سماجی شعور ہی کا احساس نہیں کروایا بلکہ نفسیاتی جانکاری کا ادراک بھی بخشا ہے ۔ اس لیے میں بجا طور پر توقع کرتا ہوں کہ آپ میرے سوال کا تسلی بخش جواب فراہم کر کے مجھے اور میرے قارئین کو فکری توانائیت سے ہمکنار کریں گے

غیاث چودھری

آپ کا سوال ظاہر میں سادہ اور باطن میں تہہ دار ہے ، بالکل الف ق کی طرح ۔ اس کا مفصل جواب دینے کے لیے تو ایک دفتر درکار ہو گا ۔ علم کی ہر شاخ ، معاشرت کے ہر شعار اور زندگی کی ہر صورت کا جائزہ لینا ہو گا ، یہ کام آسان نہیں ہے ۔

اگر جواب کو دو چار جملوں میں سمیٹنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کی سرشت اور ذہنی ساخت پر حیوانی جبلّت کے اثرات جتنے گہرے ہوں گے اس میں عدم

تحفظ "خوف" کمتری اور برتری کے احساسات اور خود بینی، خود پسندی اور خود نمائی کے جذبات جس قدر شدید ہوں گے، اس کی تن آسانی اور روایت پرستی کی روش جتنی پختہ ہوگی، اس کے کردار پر حرص وہوس اور غرض مندی کا جتنا غلبہ ہوگا، اس کے معاشرے میں جھوٹ کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوگا۔
دوسری جانب کسی معاشرے کے تہذیبی اور تعلیمی ارتقاء کو اور اس کے اقتصادی اور سماجی تحفظات کی وسعت کو دیکھ کر اور اس میں رواداری، عدل پروری حق شناسی، خدا ترسی اور دیانت ایسی صفات کا حساب لگا کر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں سچ کی عملداری اول الذکر معاشرے کے مقابلے میں وسیع ہوگی اور اس کے افراد حتی الوسع جھوٹ بولنے سے احتراز کرتے ہوں گے۔
اس اجمال کی مختصر سی تفصیل کچھ یوں ہے کہ انسان کی بے شمار نسلوں کی زندگی دفنت کے تاریک غار میں بسر ہوئی وہاں جنگل کا قانون چلتا تھا۔ جینے اور کھانے کے لیئے ہر کارروائی جائز تصور ہوتی تھی۔ بقائے اصلح یا تنومند اور طاقتور کی بقا اور برتری کا اصول رائج تھا۔ انسان جب تک کمزور تھا جانوروں سے خوفزدہ ضرور رہتا تھا مگر چھل فریب، چھین جھپٹ اور چالاکی سے اپنی جان بچائے رکھتا تھا۔ وہ گھاتیا بن کر ہی پیٹ بھر سکتا تھا۔ اس دور کے حالات و واقعات نے اور انسان کی حیوانی جبلت نے انسانی ذہن کی پرداخت اور سرشت کی ساخت پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ وہ آج تک مٹائے نہیں مٹ سکا۔ دیکھا جائے تو علم وحکمت کی ساری مہم اور ادیان کی ساری تعلیم اور جد وجہد آدمی کی سرشت سے زمانۂ تاریک کے نقش مٹانے اور آدمی کو انسان بنانے کے لیے وقف ہے۔

*

انسان نے شعور کی آنکھ کھولی اور اپنی تاریخ کا دوسرا باب شروع کیا تو ہیولوں اور مفروضوں کی وسیع دنیا کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے اپنے حواس

اور اپنی روز افزوں دانش کی مدد سے کئی اسرار کھولے اور بعض سچائیاں معلوم کیں مگر مہم آسان نہیں تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ انسان نے مدرسوں میں کتابوں کے ذریعے، اساتذہ سے اور اپنی بزرگ نسل کے علم سے ایک یقین حاصل کیا اور کئی سچائیاں قبول کیں مگر زندگی کی مختصر سی راہ میں ہی اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جو قیاس اور معلومات اس کے یقین کی اساس تھیں، وہ خام اور ناقص تھیں، سچائی تو ان کے برعکس ہے اس انکشاف کے نتیجے میں وہ جس فیصلے پر پہنچا وہ بھی بعد میں غلط نکلا۔ تحقیق و جستجو اور تجربے اور مشاہدے کی مدد سے ایک سچائی معلوم ہوئی مگر اس سچائی تک رسائی حاصل ہونے تک کئی نسلیں گزر گئیں۔ یہ الزام تو صحیح نہیں ہوگا کہ متذکرہ سچائی کا علم ہونے سے پہلے جو لوگ اس دنیا سے رخصت ہو گئے وہ جھوٹ کے پرستار تھے یا جھوٹ کی عملداری کے محافظ تھے اور پھر یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ ایک سچ میں سے کئی کئی سچائیاں نکلیں انہوں نے پہلے سچ کا دائرہ محدود کر دیا اور یوں سچ اور جھوٹ کی طرح سچ اور سچ کے درمیان بھی کشمکش جاری رہی ہے۔ سچ جسے دیانتداری سے قبول کیا گیا ہے وہ آدھا سچ نکلا اور جھوٹ جسے دل سے سچ مانا گیا، وہ جھوٹ ہی ثابت ہوا۔ سچ اور جھوٹ کی آویزش میں انسان کی فکری دیانت کا تعین کرنے میں خاصی فراخدلی سے کام لینا ہوگا اور یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ علم و حکمت کے خزانے جمع کرنے کے باوجود انسان کی معلومات نہایت محدود ہیں۔ سچ اور حقیقت کا تعین کرنے کے لئے ادراک کا سراغ پانے کے لئے ابھی کئی سانچے، زینے اور پرمے درکار ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو سچائیاں مسلمہ ہیں، انہیں انسانوں نے یا ان کی غالب اکثریت نے قبول کر لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان کا بڑا حصہ ابھی تک دورِ اولین

کے مزاج سے آزاد نہیں ہو سکا۔ اس میں نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہے مگر وہ اپنی ضرورت کے وقت اسے مفلوج کر لیتا ہے۔ کورانہ تقلید میں، اسے عافیت دکھائی دیتی ہے اور نقد و نظر سے وہ خود بھی خائف رہتا ہے۔ وہ زندگی کا جائزہ لیئے بغیر یا اس کا تجزیہ کیئے بغیر ہی عمر بسر کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم یونان کے شاعر ہومر کے دور کے دیوی دیوتا مختلف ناموں سے آج بھی اپنی پوجا کرا رہے ہیں۔ نیک و بد روحیں اب بھی انسانی دنیا پر راج کر رہی ہیں اور مظاہر پرستی کا سلسلہ بھی جوں کا توں قائم ہے جبکہ وحدانیت دنیا میں اقلیت کا مسلک ہے اس مسلک کی تفاصیل میں بھی لوگوں نے تشریحات کے ذریعے بہت سے توہمات، تعصبات اور رطب و یابس کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ بات تو کوئی نہیں مانے گا کہ جو لوگ اپنے آپ کو ایک پیغام کے شارح قرار دیتے ہیں وہ اس پیغام کے جوہر سے ناآشنا ہیں۔ وہ یقیناً آگاہ ہیں مگر ذاتی مصلحتوں اور منفعتوں کی خاطر کھرے میں کھوٹ کی ملاوٹ کرتے رہتے ہیں اور کوشاں رہتے ہیں کہ ان کے مداحوں میں عقلی اور استدلالی رجحان فروغ پذیر نہ ہو۔ وہ ڈرتے ہیں کہ ان کے معتقدین نے استدلالی انداز اختیار کر لیا تو ان کی علمیت اور بزرگی کی قلعی کھل جائے گی چنانچہ وہ لوگ جنہیں حق و صحیح کا مشعل بردار ہونا چاہیے تھا وہ جھوٹ اور گمراہی کے چوب دار بن جاتے ہیں۔ اور انسانی معاشروں میں جھوٹ کی عملداری میں توسیع کرتے رہتے ہیں

فلاسفہ کا ایک گروہ اس تھیوری پر یقین رکھتا ہے کہ احساس کمتری انسانوں کی فکر اور عمل کا محرک ہے، انسانی معاشروں کا کاروبار اسی احساس کے زیر اثر چلتا آیا ہے اور چل رہا ہے اس کے باعث جہاں کچھ کار نمایاں انجام پاتے ہیں وہاں جھوٹ کے بہت سے دفتر کھلے رہتے ہیں، خوف

سر پر سوار رہتا ہے اور آدھا سچ مقبول ہوتا ہے۔ انسان کے تاریخی پس منظر اور انسانوں کے کردار اور شعور پر اس کے اثرات جن کا شروع میں حوالہ دیا گیا ہے اگر سامنے ہوں تو اس تھیوری کو یکسر مسترد کر دینا ممکن نہیں ہے اس کی تائید میں عموماً جنگ کا حوالہ دیا جاتا ہے جو انسان کے وحشی پن کی آئینہ دار بھی ہے اگرچہ جہد البقا بھی جنگ کا ایک رُخ ہے مگر اس وقت جنگ کا صرف مجرد تصور ہی ہمارے سامنے ہے لڑائی کے سارے لوازمات اب بھی کمتری کے باعث ہی جمع کیے جاتے ہیں اور سان کی خاطر طرح طرح کے جھوٹ تراشے جاتے ہیں اگر جنگ کی آگ بھڑک اُٹھے تو اس کے پیدا کردہ ماحول میں جس قدر جھوٹ بولا اور قبول کیا جاتا ہے اتنا کسی پر سکون ماحول میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ نفسیاتی جنگ کا زیادہ حصہ جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے اور آج کے عہد میں جب تشہیر کے وسیع وسائل میسر ہیں نفسیاتی جنگ کے زیر اثر بولا جانے والا جھوٹ کا اثر گہرا اور دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ ظالم، غاصب اور حملہ آور کی تو ساری مہم جھوٹ اور فریب سے عبارت ہوتی ہے مگر حملے کا نشانہ بننے والے بھی صرف سچ کو اپنا ہتھیار قرار نہیں دیتے، وہ بھی جواب دعویٰ میں بہت سا جھوٹ شامل کر کے اپنے لوگوں کو قائل کرتے ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ میں پانچ کروڑ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ زخمی اور تباہ ہونے والوں کی تعداد کا تو آج تک صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکا۔ یورپ کے متمدن اور مہذب ملک اس جنگ کا میدان ہی نہیں بنے تھے بلکہ ان کے پڑھے لکھے لوگوں نے اسے جائز تسلیم کر لیا تھا حد تو یہ ہے کہ انہوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کے جنونی اور وحشیانہ فیصلے کو بھی صحیح مان لیا تھا اور یہ جھوٹی دلیل تسلیم کر لی تھی کہ اس کی وجہ سے جنگ کا دور مختصر ہو گیا ہے۔ یورپ

میں یہودیوں کی قطعی شکست کے بعد جنگ مشرق بعید میں بھی ختم ہو رہی تھی جاپان کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور اس کے مقتدر حلقوں میں ہتھیار ڈالنے کی تجاویز پر غور کیا جا رہا تھا اس وقت انسانوں کی بستی پر ایٹم بم گرانا ایک جرم تھا مگر اس جرم کو انصاف مان لیا گیا اور اس طرح سرد جنگ کا ایک جواز نکل آیا۔ آج اگرچہ اس کی لہر چل رہی ہے مگر بعض یورپی اور امریکی اہلِ دانش یہ خیال بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ بڑی قوتیں ایٹمی ہتھیاروں کی ایک معقول تعداد اپنے اسلحہ خانوں میں محفوظ رکھیں کیونکہ ایٹمی ہتھیار امن و سلامتی کے ضامن ہیں (البتہ چھوٹی اقوام کے ہاتھ وہ ان ہتھیاروں کو خطرناک قرار دینے پر مصر ہیں حالانکہ جنگ کا آغاز ہمیشہ کسی بڑی قوت نے ہی کیا ہے) احساس کمتری یا احساس برتری، جو اصل میں ایک ہیں، کا اس سے بہتر نمونہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ اس موقف میں جھوٹ کا کتنا حصہ ہے؟ اس سوال کا جواب ہر کوئی دے سکتا ہے

اس بحث کے دوسرے پہلو پر غور کرنے کے لیئے ہم ایک چھوٹی سی مثال کا حوالہ دے سکتے ہیں۔ ہمارا یہ تکیہ کلام ہو چکا ہے کہ ہم نے سات سال میں پاکستان حاصل کر کے دنیا کو حیران کر دیا حالانکہ ہم میں سے کس کو معلوم نہیں ہے کہ پاکستان کا قیام اور آزادی دراصل برصغیر کی آزادی کا حصہ ہے۔ یہ کہاں ممکن تھا کہ برصغیر کا ایک حصہ جسے پاکستان کا نام ملا آزاد ہو جاتا اور برصغیر کا دوسرا حصہ جسے بھارت کہتے ہیں محکوم رہتا۔ ہم سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں ہے کہ انگریز کی غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز ۱۸۵۷ء میں ہوا اور اس جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ کسی طور بھی غیر مسلموں سے کم نہیں تھا اور پھر ہمارا ایمان ہے کہ پاکستان کے قیام کا ایک تاریخی، منطقی اور ناقابلِ تردید جواز موجود ہے

ساری معلومات رکھنے کے باوجود ہم محض اپنے احساسِ برتری کی تسکین کی خاطر آدھے سچ پر قناعت کر لیتے ہیں اور اسے فروغ دیتے ہیں۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس کے باعث پوری قوم کا جو نفسیاتی رویہ بنتا ہے وہ نہ تو حقیقت پسندانہ اور سودمند ہوتا ہے اور نہ تاریخی صداقت کو ہی راس آتا ہے۔ ہمارے اربابِ علم، اصحابِ سیاست اور ذرائع ابلاغ پاکستان کی آزادی کے مختصر سی تاریخ کے بہت سے واقعات کو جس بے فکری سے مسخ کرتے اور غیر حقیقی نعرے مارتے ہیں اور لوگ نقد و نظر کے تقاضے بالائے طاق رکھ کر انہیں جس طرح قبول کرتے ہیں وہ ہمارے اسی نفسیاتی رویئے کا آئینہ دار ہے

آپ کے اس سوال کا دائرہ بڑا وسیع ہے کہ سچ کے مقابلے میں جھوٹ کی سلطنت بڑی کیوں ہے؟۔ آپ نے اچھا کیا جو تازہ وضاحت کے ذریعے موضوع کو محدود کر دیا کہ "جو لوگ سچائی سے آشنا ہوتے ہیں وہ جھوٹ کا سہارا کیوں لیتے ہیں"۔ یہ مسئلہ اخلاقیات کا ہے۔ نفسیاتی ماحول اور معروضی حالات کا ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک افراد سے ہے —

افلاطون کا خیال تھا کہ "اگر انسان جانتا ہوتا کہ اچھی زندگی کیا ہے تو وہ کبھی فاسقانہ عمل اختیار نہ کرتا۔" افلاطون کے زمانے میں بھی لوگ اخلاق کے عام ضابطے کی موٹی موٹی باتوں سے آشنا تھے مثلاً انہیں معلوم تھا کہ چوری کرنا غلط ہے اس کے باوجود وہ چوری کرتے تھے۔ اسی علم نے افلاطون کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ہم چاہیں تو پاک صاف زندگی بسر کر سکتے ہیں اور اگر طے کر لیں تو نہایت احمقانہ اور پاپی زندگی بھی گزار سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نیک زندگی کا محض علم کافی نہیں ہے اس کے مطابق عمل کرنا بھی لازمی ہے اور نیک عمل کے لیئے ارادے اور نیت

کا صاف ہونا شرط اول ہے۔ جبر کا نہیں بلکہ اختیار کا معاملہ ہے یعنی انسان فیصلہ کرنے کا مجاز ہے وہ اچھی یا بُری جو راہ چاہے اختیار کر سکتا ہے ــــــــ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب فیصلہ کرنے کی گھڑی آتی ہے تو انسانوں کی غالب اکثریت پاکیزگی کردار یا اخلاق کے تقاضوں پر نظر رکھنے کی بجائے اپنی غرض اور اپنا نفع دیکھتی ہے۔ انسان کی اس ناکامی میں اس کی شخصیت کی ناپختگی کا بھی دخل ہے۔ عدم تحفظ کے اس احساس کا بھی جو اسے نسل در نسل ورثے میں ملا ہے اور اس معاشرتی ماحول کا بھی جس میں انصاف، اعتدال اور انسانی مساوات کی روایات کمزور ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ ترغیبات، شیطانی جیکہ بھی عام انسانوں کی اخلاقی معذوری کا سبب بن جاتا ہے جیسے کچھ لوگ جھوٹ، فریب اور دھاندلی کے ذریعے چلاتے ہیں مگر محفوظ، معزز اور خوشحال رہتے ہیں ــــ

اس میں کوئی کلام نہیں کہ انسانی معاشروں میں جھوٹ کا بازار ہمیشہ تیز رہا ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ دورِ حاضر کے منظم معاشروں میں جھوٹ نے ایک فن کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور اسے ذمہ داری یا ڈیوٹی کا حصہ بھی بنا دیا گیا ہے۔ سیاست میں، ملازمت میں، تجارت میں حتیٰ کہ ادب و فن میں بھی جھوٹ کا سکہ کھرا تسلیم ہونے لگا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں جمہوری اور انسانی قدروں کے فروغ کے باعث جھوٹ کا بیوپار قدرے سرد پڑا ہے مگر ان کے بارے میں بھی دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان لوگوں کی زندگیوں میں جھوٹ کے مقابلے میں سچ کا پلہ بھاری ہے۔ حوصلہ افزاء بات صرف یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں مختلف شعبوں کے رہنماؤں اور مختلف جماعتوں اور انجمنوں کے عہدیداروں اور افسروں کے لیئے

ایک ضابطہ اخلاق موجود ہے " اس سے انحراف کرنے کی جسارت کا اگر انکشاف" ہو جائے تو متعلقہ افراد سے قیادت کی مسند عموماً چھن جاتی ہے۔ اس ضابطہ اخلاق کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ جھوٹ اور اس سے منسلک گناہوں سے دامن بچایا جائے۔ یہ ضابطہ عام شہریوں کے لیئے بھی ہے مگر اس کا پورا احترام کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے وہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے مسافر ہیں۔ انسان کی اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرنے میں بہت وقت لگے گا۔ ان کے ملکوں میں نسلی امتیاز، ناانصافی، رشوت خوری جیسے گناہ انوکھے نہیں ہیں۔ وہاں بھی جھوٹے تصورات کو فروغ دینے والے موجود ہیں۔ ان کے ذرائع ابلاغ ریڈیو ٹی وی، اخبارات وغیرہ مکمل سچ کے نقیب نہیں ہیں۔ ان کی تاریخ پر بھی جھوٹ کا سایہ ہے اور وہاں بھی مذہب کے نام پر توہمات فروخت ہو رہی ہیں۔ مگر یہ حقیقت حوصلہ افزاء ہے کہ ان مصائب کی مزاحمت کرنے اور انہیں بے نقاب کرنے کا عمل بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اس معاملے میں تیسری دنیا کے ممالک اور ان کے باشندوں کی حالت قابلِ رحم ہے۔ یہاں جھوٹ کے پل باندھتے میں لوگ کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ عوام کو جذباتی نعروں اور سطحی معاملات میں الجھانے والے عموماً کامیاب رہتے ہیں۔ خوشامد، غبن، زر اندوزی، اختیارات کا ناجائز استعمال، فرض ناشناسی، دوسروں کا حق مارنا اور ایسے ہی دوسرے گناہ ایک استثنا نہیں بلکہ ایک رواج اور قاعدہ ہیں۔ دنیا داروں کی بات چھوڑیں، تیسری دنیا کے فرقہ پرستوں اور مجاہدے یا نفس کشی کے دعویداروں میں بھی غالب اکثریت خود غرض اور وحشی دنیا سازوں کی ہے۔ تیسری دنیا کے حکمرانوں نے اپنے افکار اور اپنے کردار کے لیئے الگ الگ آئینے آویزاں کر رکھے ہیں۔ بیش از بیش دولت اور اختیار کی خواہش اور عیش وعشرت اور ناحق مسرت کی طلب اور عوام اور معاشرے

کے خرچ سے ان خواہشات کی تسکین کے سامان کرنا آئینِ حکمرانی میں شامل کر لیا گیا ہے ایسا کفر اعلیٰ سطح پر عام ہو گا تو نچلی سطح پر انہیں اپنانے اور اختیار کرنے والوں کی کمی نہیں ہو گی۔ یوں جھوٹ ایک بہت بڑے آبشار کی طرح گرتا ہے اور پھر پھیل کر معاشرے کو اپنی پلیٹ میں لے لیتا ہے۔ ہم مشرق والے اگرچہ اپنی تحریف میں ہر تعلیٰ کو دل سے پسند کرتے ہیں مگر کبھی ٹھنڈے دل سے سوچیں تو ہم علم و ہنر، صنعت و تجارت میں ہی نہیں تہذیب و شائستگی اور اخلاق و آداب میں بھی انتہائی پس ماندہ ہیں۔ ہماری شخصیت دوہری ہے اور ہمارے ظاہر و باطن میں جھوٹ کی خلیج حائل ہے۔ ہمارے اعمال و کردار کی وجہ سے بھی آج کرہ ارض پر سچ کے مقابلے میں جھوٹ کی سلطنت کا دائرہ وسیع ہے۔ بظاہر صورتِ حال تاریک نظر آتی ہے مگر اس میں سے روشنی کی کرنیں بھی پھوٹ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر پہلی بات تو یہ ہے کہ جھوٹ فطرت اور قدرت کے قوانین اور انسان کی روح کے تقاضوں کے خلاف ہے جھوٹے آدمی کا ضمیر بھی جھوٹ کو قبول نہیں کرتا اور جھوٹ ہمیشہ سچ کے نام پر ہی بولا جاتا ہے۔ جھوٹ کی مذمت اور مزاحمت کا سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود جھوٹ پرانا ہے۔ یہ سلسلہ بتدریج پھیل رہا ہے۔ علم کو جوں جوں فروغ حاصل ہو گا اور نقد و نظر کی انفرادی اور اجتماعی صلاحیتیں جس قدر صیقل ہوں گی جھوٹ کی عملداری اسی قدر سمٹتی چلی جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ منصفانہ بنیادوں پر معاشروں کی معیشتی، سیاسی اور تہذیبی تنظیم اور ترتیب کا شعور اور وقوف عام ہو رہا ہے اور انسان کو عدم تحفظ کے احساس اور دورِ وحشت کی نفسیات سے نجات دلانے کے لیے پہلی بار قومی پیمانوں پر باقاعدہ جدوجہد ہو رہی ہے اس جدوجہد کی

کامیابی جھوٹ کی سلطنت پر سب سے کاری وار ثابت ہوگی۔

تیسری بات یہ ہے کہ انسان کی تاریخ کا تازہ باب صرف دو ڈھائی ہزار سال پر محیط ہے۔ جبکہ انسان کی عمر دس لاکھ سال سے بھی زیادہ ہے۔ گویا، ہماری نگاہیں ایک اونچے پہاڑ کے دامن پر ہی لگی ہوئی ہیں اس کے اوپر ہم دیکھ نہیں سکتے کیونکہ پہاڑ کی بلندی گاڑھی دھند میں چھپی ہوئی ہے کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی ترقی یافتہ صورت تاریخ کے اس دور میں نمایاں ہوئی ہے ہم اسی میں زندگی کے مفاہیم اور معاشرے کے معنی ڈھونڈ سکتے ہیں لیکن اگر کوئی کہے کہ اس سے پہلے بھی انسانی تاریخ میں بہت سے متمدن اور مہذب معاشرے گزر چکے ہیں اور ان میں سچ ہی کا بول بالا تھا تو حقائق اور معلومات کی بنیاد پر ہم اس کی تردید کرنے سے قاصر ہیں آخر ارسطو نے کچھ سوچ کر ہی دعویٰ کیا تھا کہ انسان شکم مادر سے ہی پورا علم حاصل کر لیتا ہے۔ دنیا میں صرف اس علم کو اجاگر اور نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جوں جوں اس علم کو اجاگر اور نمایاں کرنے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے علم کی سرحدیں پھیل رہی ہیں۔ اکثر فلسفیوں اور سائنسدانوں کو ارسطو کے اس قول سے اختلاف ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ لاکھ دو لاکھ سال پہلے اگر انسانی معاشرہ راست باز، صاف ستھرا اور نیک اور پاک تھا۔ تو آج سے ہزار سال بعد پھر ایسا ہی معاشرہ قائم ہو جائے جس میں انسان اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولنے سے کترانے لگے اور کرہ ارض پر جھوٹ کی عملداری کا نشان ہی مٹ جائے۔

ظہیر بابر

۲۶ مارچ ۱۹۹۰ء

محترم ظہیر کاشمیری صاحب

جناب عالی، آپ اردو ادب میں ایک ایسی شخصیت کے مظہر ہیں جو شاعری اور تنقید دونوں میں بغیر کسی معنوی تضاد کے منعکس ہوتی ہے آپ نے شعور کی رہنمائی میں اپنا طویل شعری سفر طے کیا ہے اور یہی شعور آپ کی تنقید کا طغرائے امتیاز بھی ہے۔ آپ نے اُن تمام شعور دشمن رویوں کے خلاف سالہا سال جہاد کیا ہے جو ابنِ آدم کی ترقی اور فروغ میں رکاوٹ بنتے ہیں یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ آپ نے سچ کے حق میں جھوٹ کے خلاف حرف و صوت کی سطح پر ایک انتہائی پُرعظمت اور مقدس مجادلہ کیا ہے۔ آپ "عظمت آدم" کے حدی خواں بھی ہیں۔ اور "ادب کے مادی نظریات" کے فروغ کے امین بھی ہیں۔ لہٰذا میں بجا طور پہ آرزومند ہوں کہ آپ اپنے سائنسی نظریات اور طویل صحافتی تجربے کی روشنی میں میرے سوال کا جواب عنائیت فرمائینگے۔

غیاث چودھری

آپ نے سچ کے بارے میں سوال کیا ہے سب سے پہلے ہمیں یہ تعین کرنا ہوگا کہ سچ کا مطلب کیا ہے اگر تو سچ کا مطلب صداقت کل ہے۔ یعنی وہ صداقت جو تمام دوروں پر محیط ہوگی، تمام زمانوں پہ محیط ہوگی، تمام انسانی معاشروں پر محیط ہوگی، پوری تاریخ پر محیط ہوگی تو اس سچ کا پتہ انسان آج تک نہیں چلا سکا۔ اس دنیا میں سچ ہمیشہ اضافی اور اعتباری رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک زمانہ تھا جب انسان درختوں کی پوجا کرتا تھا دھرتی ماتا کی پوجا کرتا تھا اور فطرت کے دیگر مظاہرات کا پجاری تھا۔ اس وقت انسان کی نظروں میں یہی سچ تھا اور آپ جانتے ہیں۔ کہ اس مفروضہ سچ سے بڑی بڑی تہذیبیں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آیا۔ جب انسان نے اس کائنات میں (dualism) ثنویت کے تصور کو فروغ دیا

اور اس کی بنیاد پر ایک بڑے کلچر کو تخلیق کیا۔ پھر جب زمانہ اور بدلا تو انسان نے تثلیث کی بات کی اس کو سچ جانا اور اس پر بڑی عظیم سلطنتوں کی بنیاد رکھی۔ بعد کے دور میں یہ تصور آیا کہ یہ ساری کائنات ایک خالق نے پیدا کی ہے ایک وحدۂ لاشریک نے پیدا کی ہے چنانچہ اس تصور کو بھی دنیا میں مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ تصور آج بھی دنیا کے بڑے حصے پر اثر پذیر ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان مختلف ادوار میں اپنی آگہی کے مطابق اپنے اندر سے سچ کا ایک ہیولا تراشتا رہا ہے اور اس کو پوجتا رہا ہے۔ اس طریقے سے اگر ہم آج کے دور کا مطالعہ کریں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پچھلے تین چار سو سال سے شاہنشاہیت اور سامراج نے دنیا بھر کے کمزور ملکوں کو غلام بنا رکھا ہے یہ آج کی یعنی پچھلے دو تین سو سال کی حقیقت ہے غریب اقوام جو کہ پسماندہ ہیں اُن پر صنعتی سرمایہ دار ملکوں نے قبضہ جما رکھا ہے اور آج کے جو پسماندہ اور غریب لوگ ہیں، قحط، بیماری اور غلامی کا شکار ہیں وہ یہ struggle کر رہے ہیں کہ کسی طریقے سے جابر طاقتوں کا غلبہ اپنے اوپر سے ہٹا دیں اور آزاد ہو جائیں چنانچہ اگر آپ آج پر سچ (عرف عام میں سیاسی سچ) کی بات کریں تو آج کا سچ وہی ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے ذہنی رویئے اور انسان کی مادی روحانی اور حیاتیاتی ضرورتیں آدمی کے سچ کو خود متعین کرتی ہیں اور جب وہ دور گذر جاتا ہے جب اس سماجی ماحول کی حقیقت ہی بدل جاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی انسان کے سچ کا تصور بھی بدل جاتا ہے کسی زمانے میں آپ جنگ کرنے جاتے تھے تو ایک خاص قسم کی weapenary کا استعمال سچ تھا اور ہم یہ کہتے تھے کہ فلاں فوج جیت جائے گی کیونکہ اس کے پاس ہوائی جہاز بھی ہیں۔ اس کے پاس بحری جہاز بھی ہیں اس کے پاس راڈار بھی ہیں اور اس بات کو ایک حقیقت سمجھا جاتا تھا کہ جس فوج کے پاس آدمی زیادہ ہوں، اسلحہ زیادہ اور اچھا ہو وہ میدان جنگ میں فتح حاصل کرے گی لیکن آج کے دور میں ہوائی جہاز

تو کجا جیٹ ہوائی جہاز اور عام بحری کشتیاں تو کجا بڑے بڑے بحری جہاز ہو رہے ہیں وہ آج کا پیرسح نہیں رہے اب وہ عجائب گھروں OUT OF Date کی زینت بن گئے ہیں آج inter continental missiles اور ایسے مہلک ایٹمی ہتھیار جو لمحوں میں ساری دنیا کو تباہ کر سکتے ہیں بروئے کار آ چکے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اب انسانوں کو تباہ کرنے کے لیئے روائیتی ہتھیاروں کی بجائے electrons کو دنیا کے اوپر پھینکا جائے گا lazer شعاعوں کو پھینکا جائے گا تو آج جنگی حکمت عملی کا پیرسح وہ ہے جو کل نہیں تھا کل کا پیرسح obsolete ہو گیا ہے اس طریقے سے پیرسح جو ہے انسانی ذہن کیساتھ انسانی معاشروں کے ساتھ انسانی اجتماعوں کے ذہنی رویوں کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ارتقا کے ادوار میں سے گذرتا رہتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسا پیرسح ہے جو durable ہو۔ جو اگرچہ صداقتِ کل نہ ہو لیکن ایسا پیرسح ہو جس کو ہم بہت دیر تک اپنے ارتقا کے لیئے استعمال میں لا سکیں؟ تو اس کے بارے میں بھی دنیا میں مختلف مکاتیبِ فکر ہیں مختلف فلسفے ہیں اور مختلف نظریئے موجود ہیں۔

جہاں تک میرے اپنے خیال کا تعلق ہے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر انسان تمام کائنات کی حفاظت و ترقی کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ اگر وہ نباتات کی حفاظت و ترقی کا ذمہ نہیں لے سکتا، اگر وہ جمادات کی حفاظت و ترقی کا ذمہ نہیں لے سکتا اگر وہ تمام پھیلے ہوئے بحر و بر کی ترقی و حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ اگر وہ ثوابت و سیار کی حفاظت و ترقی کا ذمہ نہیں لے سکتا تو کم از کم وہ نوعِ انسان کی حفاظت و ترقی کا ذمہ ضرور لے سکتا ہے اور نوعِ بشر کی حفاظت کا ذمہ اس لئے اسے لینا چاہیئے کہ وہ خود بھی اس نوع سے تعلق رکھتا ہے یہ وہ کم از کم پیرسح ہے جس کو لے کر ہم تاریخ کے کئی ارتقائی دوروں میں اپنے ساتھ لے کر چل سکتے ہیں۔ سائنس کا خیال ہے کہ یہ دنیا اربوں سال پہلے big bang

سے پیدا ہوئی اور big bang سے پیدا ہو کر آج تک یہ مختلف کیمیائی اور مادی مرحلوں اور اندرونی تبدیلیوں کے دوروں سے گذرتی رہی ہے حرکت و حرارت کے مختلف مرحلوں سے گذرتی رہی ہے اور پھر اس کے بعد یہ انسانی تخلیق کے مرحلہ تک آن پہنچی۔ اگر اس سائینسی گمان کو بھی صحیح مان لیا جائے تو نوع انسانی کا فائدہ اور اس کی حیاتیاتی بقا اس میں ہے کہ وہ ارد گرد پھیلے ہوئے ماحول کو دیکھے، اُسے جانے، اُسے پرکھے اور ان تمام اسرار و رموز کو جاننے کی کوشش کرے جن پر فطرت کا نظام چل رہا ہے اور پھر اپنے مشاہدہ علم اور تجربے کی روشنی سے فطرت کی زور آور قوتوں کو مسخر کر کے اپنے کام میں لائے۔

فطرت، کائنات یا ارد گرد میں لامحدود ماحول میں کروڑوں processes کام کر رہے ہیں بعض processes ایسے ہیں جو انسانی زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں اس کی iyco-physical existance کو ترقی دیتے ہیں اور کئی processes ایسے ہیں جو اس کی زندگی میں توڑ پھوڑ پیدا کر دیتے ہیں اور اس کی نوع کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر زلزلے، طوفان برق و باراں اور آندھیاں وغیرہ یہ تمام چیزیں انسان کو غیر محفوظ بناتی ہیں جب ہم نوع انسانی کو بچانے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس میں یہ چیز بھی شامل ہوتی ہے کہ یہ جو خلاف زندگی عوامل ہیں ان پر قابو پایا جائے ان پر فتوحات حاصل کی جائیں تاکہ نوع انسان کا جو period of duration ہے اس کو بڑھایا جا سکے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نوع انسان اس کرّے پر پچاس ہزار سال یا ایک لاکھ سال سے آباد ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس عرصے میں ہم نے تسخیر فطرت کا کام تندھی سے اور تسلی بخش طور پر سرانجام دیا ہے یا ہم دیگر غیر ضروری اعمال و افعال میں اپنا وقت ضائع کرتے رہے ہیں جب میں تاریخ انسانی کا مطالعہ کرتا ہوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان اپنی تمام تخلیقی قوتوں کے باوصف فطرت کی تسخیر کے کام

میں بہت پیچھے رہ گیا ہے کیونکہ یہ نوعی جنگوں میں مصروف رہا ہے۔ اپنوں کے خلاف جنگ کرتا رہا ہے کبھی قبیلوں کی صورت میں آپس میں لڑتا رہا ہے کبھی fuderal states کی صورت میں ایک دوسرے سے دست و گریباں رہا ہے یا سرمایہ دار sosiety میں منتقل ہو کے اپنی ہی نوع کا قتل عام کرتا رہا ہے بڑی بڑی بھیانک جنگوں کو جنم دیتا رہا ہے کبھی یہ فاشزم کے پردے میں ایک دوسرے کو تباہ کرتا رہا ہے تو یہ جو آپس کی جنگ و جدل ہے اس نے آدمی کی بہت ساری energy اور بہت سارا وقت ضائع کر دیا ہے اگر یہ نوعی جنگوں میں نہ الجھتا اور ایسے معاشرے بناتا جو مبنی برانصاف ہوتے جو محبت کے رشتوں کو زیادہ مضبوط کرتے انسانی آگہی کے لیئے زیادہ سے زیادہ سامان مہیا کرتے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ نوع انسانی نے پچھلے ایک لاکھ یا پچاس ہزار سالوں میں جو اپنا وقت ضائع کیا ہے اس کو کام میں لا کر آج وہ زہرہ، مشتری اور پلوٹو وغیرہ ثوابت و سیار کے اسرار و رموز بہت حد تک جان چکا ہوتا اور آج انسانی زندگی نامیاتی، حیاتیاتی اور ارتقائی طور پر بہت زیادہ آگے بڑھ گئی ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ ایک نوع کی حیثیت سے اپنا سفر بہتر طریقے سے جاری رکھے اور شرف انسانی کی منزلیں تیزی سے طے کر سکے تو پھر اس کے لیئے ضروری ہے کہ اس نے جو نامنصفانہ معاشرے بنا رکھے ہیں ان کو توڑ کے re-structure کرے اور ایسے معاشرے قائم کرے جن کی بنیاد انصاف پر ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ جو چیزیں نوع انسانی میں جنگ و جدل کا باعث بنتی ہیں استحصال کا باعث بنتی ہیں نوآبادیاتی نظام پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں لوٹ کھسوٹ کا باعث بنتی ہیں گوری یا کالی چمڑی کی بنیاد پر جنگ کرنے کا باعث بنتی ہیں اور جغرافیائی تسلط کی خاطر جنگوں کا باعث بنتی ہیں ان تمام احوال و واقعات کو ختم کر دے کیونکہ نوع بشر کی حفاظت کا راز اس میں ہے کہ وہ متحد ہو اور متحد رہتے ہوئے فطرت کے اسرار و رموز کو جاننے کی کوشش کرے اور جہاں جہاں اسے یہ معلوم ہو کہ فطرت اس کے خلاف عمل پیرا ہے اسکو وہ conquare

کرے اور وہ فطری قوتیں جو انسان کو آگے بڑھاتی ہیں ان کو اور آگے بڑھائے۔

اس مسئلے پر بھی ہمارے درمیان دو مکاتیب فکر موجود ہیں ایک مکتبۂ فکر ڈارون کا ہے وہ کہتا ہے اگر ہم فطرت کا مطالعہ کریں تو اس میں survival of the fittest کا اصول کارفرما نظر آتا ہے یعنی جو نوع طاقتور ہوتی ہے وہ survive کر جاتی ہے اور جو کمزور ہوتی ہے وہ ناپید ہو جاتی ہے اس نکتہ نظر سے وہ کہتا ہے اگر دنیا میں چند لوگ اکثریت پر حکومت کرتے ہیں ان کو لوٹتے ہیں اور لوٹ کھسوٹ کو آگے بڑھاتے ہیں اور خود کو خوب موٹا تازہ کرتے ہیں تو یہ فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے چنانچہ ڈارون نے اپنے دور میں بورژوازی اور اس کی لوٹ کھسوٹ کو جائز قرار دیا۔ اس کے مقابلے میں دوسری طرف مارکس کا نظریہ ہے اس نے ڈارون کو یہ جواب دیا تھا کہ یہ جو لوٹ گھسوٹ کا فلسفہ ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے یہ حیوانیت کی سطح تک تو بالکل درست ہے اس لیئے کہ حیوانی ذہن کی development ایک خاص حد تک ہوتی ہے لیکن انسانی ذہن چونکہ حیوانی ذہن سے بہت بلند ہوتا ہے اور ارفع و اعلیٰ ہے اس لیئے اسے حیوانی نقطۂ نظر سے جانچنا غلط ہے۔ انسان میں بعض نفسی قوتیں ایسی ہیں جو حیوانی نوعوں میں نہیں پائی جاتیں ایک ان میں سے خود شناسی اور خود شعوری کی صلاحیت ہے جس سے وہ analysis کرتا ہے اور دوسرے وہ اپنا ایک ideal متعین کر کے حالات کو بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس اعتبار سے انسان کو حیوانی سطح پر لاکر سوچنا یہ صرف ڈارون ہی کر سکتا ہے لیکن جو لوگ انسانیت کے منکر ہیں انسانی سماج کے منکر ہیں اور بشریت کے منکر ہیں وہ اپنے آپ کو کبھی بھی ڈارون کی سطح پر لانے کے لیئے تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ انسان کی عظمت یہی ہے کہ اگر انسانی معاشروں میں کوئی لوٹ گھسوٹ کا تصور ہے، بے انصافی کا تصور ہے تشدد کا تصور ہے، لوگوں کو مار دینے کا تصور ہے جنگیں پیدا کرنے کا تصور ہے قتل عام کرنے کا تصور ہے تو انسان ایک تخلیقی قوت کی حیثیت سے

اجتماعی طور پر اس کے خلاف لڑے اور انسانی معاشروں میں امن پیدا کرے اور ایسا مضبوط اتحاد پیدا کرے کہ وہ جو تسخیر فطرت کی منزلیں ابھی تک طے نہیں کر سکا ان کو جلد از جلد طے کر سکے ۔ تو پیچ کی ایک صورت یہ بھی ہے جو میرے ذہن میں آتی ہے اور یہ پیچ کا تصور میرا ذاتی ہے جس پر میں اپنی ساری عمر عمل پیرا رہا ہوں آج بھی ہوں اور آئندہ بھی رہوں گا

ظہیر کاشمیری
۱۴ مئی ۸۹ء

محترم پروفیسر عارف عبدالمتین صاحب

جناب عالی ـــــ آپ برصغیر کے نامور اور صاحب الرائے نقادوں میں عصر حاضر کے عہد آفرین شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ اصناف سخن میں سے کئی ایک کے موجد ہیں۔ آپ نے انسانی ذات کے داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر جس مجادلے کی طرح ڈالی ہے اور انسانی رفعت کے تقدس کو برقرار رکھا ہے وہ آپ کی عظمت کردار کا ثبوت ہے۔ آپ نے نہ صرف دکھ کی میراث کو تحسین فن کے قالب میں ڈھالا بلکہ مٹی کی پکار پر تیشۂ تخلیق سے کوہ امکانات کا جگر کاٹ کر انوکھے اسلوب و بیان کی موج در موج ندیاں بہا دیں۔ آپ نے اپنے خون جگر کی آتش سیال سے پیمانۂ دیدہ و دل کو نہ صرف لب ریز رکھا بلکہ زندگی بھر صلیب غم کا بوجھ بھی تن تنہا برداشت کیا۔ آپ نہ صرف انسانی کرب کے بحر عمیق میں غوطہ زن رہے ہیں بلکہ انسانی صعوبتوں کی وارداتی کیفیات میں سے گذرنے کا طویل سفر بھی طے کیئے ہوئے ہیں لیکن آپ ان تمام جانکاہیوں کے باوجود کبھی کشکول بدست نہیں ہوئے۔ آپ نے ہمیشہ خود کو عود کی مانند جلائے رکھا جس سے گلزار فن مہک رہا ہے آپ کی تمام زندگی درس و تدریس سے عبارت رہے آپ ترقی پسند تحریک کے نہائیت مستقل مزاج اور سرگرم علمبردار ہیں۔ لہٰذا میں بجا طور پر آپ سے ملتمس ہوں کہ آپ ایک وسیع النظر مفکر ہونے کے ناطے میرے سوال کا جواب اس کے معنوی سیاق و سباق میں ارزانی فرمائیں۔

غیاث چودھری

شکریہ غیاث چودھری صاحب، آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم اور نازک ہے آپ نے مزید پابندی یہ لگا دی ہے کہ میں اس کا جواب اس کے معنوی

سیاق و سباق کے حوالے سے دوں۔ تو گذارش یہ ہے کہ آپ کا سوال دو بنیادی صداقتوں کا ادراک کرواتا ہے۔ پہلی صداقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جھوٹ کی عملداری کو مقابلتاً زیادہ نمایاں دکھایا گیا ہے، دوسرے اس میں آپ نے اس بات کا اظہار فرمایا ہے کہ جھوٹ کی عملداری کے باوصف ہمارے یہاں ہر کوئی سچ کا حامی یا دعویدار کیوں ہے تو جواباً عرض یہ ہے کہ ہم سب فطرتاً سچ کے حامی ہیں اس لیئے کہ ہمیں نیابتِ الٰہی کا ارفع مقام حاصل ہے اور نیابتِ الٰہی ایک ایسا شرف ہے جس کی بدولت ہم لوگ اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں گویا کہ سچ کا حامی ہونا ایک بشری تقاضہ ہے کیونکہ ہم صداقتِ مطلق کے ایک مظہر کی حیثیّت رکھتے ہیں اور صداقتِ مطلق خیر سراپا ہے اور ہم اس خیر کے حوالے سے جس شرف کے امین ہیں، اس کا تقاضہ یہی بن سکتا ہے کہ ہم صداقت کی حمائیت کریں گے مگر آپ کا سوال یہ بھی ہے کہ ہم حامی ہونے کے علاوہ دعویداری کے زیادہ علمبردار کیوں ہیں میری عاجزانہ رائے میں سچ کی عملداری میں کمی اور جھوٹ کی عملداری میں وسعت کا سبب اس legacy کے منفی عناصر کا نتیجہ ہے جو ہم میں ایک طویل عرصہ عہدِ غلامی میں بسر کرنے کی وجہ سے درآئی اور ہم اکتالیس بیالیس سال کے طویل عرصہ کے دوران اس legacy کے منفی عناصر سے چھٹکارا نہیں پاسکے۔ اس عہدِ غلامی کی legacy کے کچھ روشن عناصر بھی تھے لیکن بدقسمتی سے ہم نے ان کو جہاں نظر انداز کیا وہاں منفی عناصر کو ہم نہ صرف چھوڑ سکے، ان کو eradicate نہ کر سکے بلکہ ان کو بلند کرتے چلے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ سچ تو کم ہوتا رہا اور جھوٹ کی عملداری میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہ صورتِ حال تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں آپ کو نظر آتی ہے لیکن انسان جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ فطرتاً سچ کا حامی ہے اس لیئے سچ بھی فوقتاً فوقتاً اپنے آپ کو ری پلیس کرتا رہا ہے لیکن جہاں تک انسانی مستقبل کا سوال ہے اور ہمارے یہاں بالخصوص اس کی application یا اس کے اطلاق کا تعلق ہے تو میں عرض کروں گا کہ میں اس سلسلے میں بہت رجائیت پسند ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہم بالآخر سچ کی فطری حیثیت کو پورا کرتے ہوئے ایک ایسا معاشرہ برپا

کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس میں کہ سچ کی عملداری ہو اور جھوٹ کی عملداری کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ کوئی ایسی رجائیت نہیں ہے جو کہ صرف سچ کی حامل ہو۔ بلکہ اس کی بنیاد میں میرا یہ یقین کارفرما ہے کہ انسان نے چونکہ سچ کا حامی ہے اور اس کی فطرت کے اندر سچائی موجود ہے۔ جو اس کو اشرف المخلوقات بنانے کا ضامن ہے۔ اس لیئے یہ صورتِ حال جو آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہم اس Legacy کے منفی عناصر کی وجہ سے اپنی زندگی سے خارج نہیں کر سکے وہ یقیناً ہماری زندگی سے خارج ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں آپ دیکھیں گے کہ جھوٹ سچ کی دعویداری سے یقیناً دستبردار ہو جائے گا کیونکہ سچ کسی دعوے کا محتاج نہیں ہے۔ سچ اپنا اظہار کرتا ہے، سچ اپنا خود دعویدار بن کر نہیں آتا تو یوں سمجھیئے کہ دعویداری ایسا حربہ ہے جس سے کہ باطن میں اگر کچھ عناصر ایسے ہیں جو کہ جھوٹے ہیں تو وہ اس سچ کا چولا پہن کر ہمارے سامنے آنے کی کوشش کرتا ہے جو کہ ہماری فطرت سے تعلق رکھتا ہے تو جب فطرت یعنی خیر، صداقت، حسن، محبت، یہ عناصر جب ہماری زندگی میں ایک حقیقت کا روپ دھار لیں گے تو جھوٹ کی نہ صرف قلعی کھل جائے گی بلکہ جھوٹ کو سچ کی دعویداری کی بھی گنجائش باقی نہیں رہے گی میں محسوس کرتا ہوں کہ سچ اپنے آپ کو ظاہر کرے گا، اپنے ultimate truimph کے حوالے سے تو اس وقت جھوٹ کی دعویداری سچ کے حوالے سے یقیناً اختتام پذیر ہو جائے گی۔

آپ کے اٹھائے ہوئے سوال یا مسئلے کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہماری سوسائٹی پوری چار دہائیوں میں ناہموار رہی ہے اس ناہموار سوسائٹی میں بالائی طبقے نے زر کو یا حصول زر کو اپنا مطمح نظر بنایا اور زیریں طبقے نے اپنی ناداری اور عسرت کی بنیاد پر اپنے آپ کو عدمِ تحفظ کا شکار پایا۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بالائی طبقہ جب زر اندوزی کو اپنی منزل قرار دیدیتا ہے تو اس منزل کی غیر اخلاقی بنیاد اس کو کچھ کچھ لگاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ جھوٹ پر تکیہ کرتا ہے اور سچ کی دعویداری پر اپنے آپ کو آمادہ پاتا ہے۔ نچلا طبقہ اپنے حقوق کی

بنیاد پر بہت سی اذیتوں اور تکلیفوں کا شکار ہو جاتا ہے اور سوسائٹی میں ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے جو بیمار ہے صحت مند نہیں ہے اس کی صحت کی بحالی کے لیئے ضروری ہے کہ ہم سوسائٹی کی ناہمواریت کو ختم کر دیں جب یہ ناہمواریت ختم ہو جائے گی تو عدم تحفظ کی فضا، زر اندوزی کا رویہ، ان سے ہماری سوسائٹی کے افراد دستبردار ہو جائیں گے اور ایسا کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ ہم اس اخلاقی معیار کو سامنے رکھیں جس میں کہ چیزوں کو پرکھنے کا، سمجھنے کا، وہ انداز اپنا لیا جاتا ہے جو طبقاتی نفرت پر نہیں بلکہ عالمگیر محبت اور اخوت پر مبنی ہوتا ہے عالمگیر اور یونیورسل قسم کی love سب کے لیئے خیر اور کسی کے لیئے بھی نہ نفرت نہ انتقام، بلکہ

love for all and hatred for none

یہ ایک اخلاقی معیار جب ہم اپنا لیں گے تو پھر مجھے یقین ہے کہ سوسائٹی میں نہ تو جھوٹ کی بالادستی کا المیہ دیکھیں گے اور نہ ہی سچ کی جھوٹ کی طرف سے دعویداری کا دکھ محسوس کریں گے ہم سچ کی عملداری کو ایک زندگی بخش صورت حال کے طور پر قبول کریں گے اور جھوٹ کو، اپنی پسپائی کی وجہ سے، کسی لبادے کی، جو سچ سے عبارت ہو، ضرورت نہیں رہے گی۔

میں نے جس عالمگیر محبت اور اخوت کا ذکر کیا ہے اس کے سوتے آنحضور صلعم کی ایک حدیث مبارکہ سے طلوع ہوتے ہیں آپ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو۔ خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم، صحابہ کرام نے حضور سے استفسار فرمایا کہ یارسول اللہ صلعم مظلوم بھائی کی مدد تو ہماری سمجھ میں آ گئی لیکن ظالم بھائی کی مدد ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں مظلوم کو ظلم سے بچا کر اور ظالم کو ظلم سے روک کر۔ اسی حدیث مقدسہ کی روشنی میں میں نے یہ دو شعر کبھی تخلیق کیے تھے کہ:۔

میں حرفِ دُعا کا سلسلہ ہوں،
عالم کی نجات چاہتا ہوں!
مقتول کی مغفرت کا طالب،
قاتل کی طرف سے خوں بہا ہوں!

عارف عبدالمتین

محترم میاں عبدالرشید صاحب

جناب عالی! آپ ہمارے ان اکابر دانشوروں میں سے ایک ہیں۔ جن کا تاریخ فلسفہ اور مذہبیات بالخصوص دین اسلام اور سیرت النبی کا بڑا بسیط مطالعہ ہے آپ کو عملاً بھی روحانی واردات میں سے گذرنے اور ان کا تجربہ کرنے کا قیمتی موقع ملا ہے پھر آپ نے تمام عمرانی معاملات، مابعد الطبیعاتی کیفیات اور نفسی احوال کا محاکمہ بھی کیا ہے جس کا بصیرت افروز اظہار آپ کی کالم نگاری کا طغرائے امتیاز ہے آپ کی تصانیف آپ کے تہذیبی اور علمی شعور کی تابندہ مظہر ہیں اس پر مستزاد یہ کہ آپ کو قرآن مجید کی تفسیر قلم بند کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے لہٰذا میں آپ سے بجا طور پر توقع رکھتا ہوں کہ آپ میرے سوال کے جواب سے میری اور میرے جیسے لاتعداد تشنہ گان فکر و نظر کی پیاس بجھائیں گے اور اپنے اس تبحرِ علمی سے ہمیں استفادہ کرنے کا موقع فراہم فرمائیں گے جو اردو اور انگریزی ہر دو زبانوں پر محیط ہے۔

غیاث چودھری

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! آپ نے یہ سوال دریافت فرمایا ہے کہ سچائی ایک ہے اور ہر دل میں سچائی کی محبت بھی موجود ہے تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں ہوتا اور دنیا میں اس قدر انتشار کیوں ہے۔ میری ناچیز سمجھ کے مطابق اس کی ایک وجہ یہ ہے جسے میں مثال سے واضح کرتا ہوں کہ اگر دانے ایک کھیت میں بو دئیے جائیں لیکن ان کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہ ہو کوئی ان کی آبیاری نہ کرے کوئی ان کی تلائی نہ کرے کوئی ان کی حفاظت نہ کرے اور جب وہ پودے بن جائیں اور ان کو پھل لگ جائیں تو پھر ان کو کوئی اکٹھا کرنے والا نہ ہو اور اس اناج کو اکٹھا کر کے کوئی استعمال میں نہ لائے تو وہ بکھرے ہوئے دانے اپنی جگہ تو رہیں گے لیکن ان سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ یہی صورت سچائی کی ہے

سچائی ہر دل میں موجود ہے لیکن جب تک ایسی شخصیت نہ ہو جو لوگوں کے اندر سچائی کی محبت کو از سر نو پیدا نہ کرے، ان کے اندر ایک ولولہ ایک جوش پیدا نہ کرے۔ اس وقت تک یہ چیز چھپی رہتی ہے۔ بسااوقات دنیاوی دھندوں کے اندر پڑ جانے کی وجہ سے یہ چیز دھندلا جاتی ہے اور انسان اس کو فراموش بھی کر دیتا ہے اس کے لیئے ضروری چیز یہ ہے ایسی شخصیت ہو جو لوگوں کو Motivate کرے اور ان کو اس بات پر آمادہ کرے کہ سچائی کے لیے قربانی دینی چاہیئے۔ سچائی کے لیئے کوشش کرنا چاہیئے سچائی کو اپنانا چاہیئے۔

اسی بات کو میں دوسرے انداز میں یوں پیش کرتا ہوں کہ عمارت بنانے کے لیئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک انجینئر اور دوسرے سامانِ عمارت بہت اچھا ہو لیکن انجینئر کوئی نہ ہو وہ سامان ادھر اُدھر بکھرا پڑا رہے تو اس سے کوئی عمارت تو نہیں بنے گی۔ دوسری طرف انجینئر تو ہے مگر سامان بو نکما ہے، ناکارہ ہے اینٹیں "ہیں بتی"، ہیں سیمنٹ از کار رفتہ ہے تو اس صورت میں وہ انجینئر جو عمارت بنائے گا وہ ناپختہ ہوگی۔ لہٰذا دونوں چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شخصیت عظیم ہو اور پھر وہ سچائی کی محبت کو لوگوں کے اندر Motivate محرک کرے۔ ان کے اندر ایک ولولہ پیدا کرے ان کی شخصیتوں کو نکھارے ان کا اعتماد حاصل کرے اور ان کو ساتھ لے کے چلے۔ اُن کے سامنے چھوٹے چھوٹے مقصد رکھتا جائے۔ اس طرح ایک مقصد جب حاصل ہوگا تو پھر ان کا حوصلہ بڑھے گا اس طرح آگے آگے پھر ان کو بڑی منزل کی طرف لے جائے۔ جب تک یہ دونوں چیزیں نہ ہوں اس وقت تک جو سچائی لوگوں کے اندر موجود ہے اس سے کچھ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

تیسری بات جو میرے ناچیز مشاہدے میں آئی ہے یہ ہے کہ ۸۰ ٪ انسان ایسے ہوتے ہیں جو زمانے کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں جو بھی رنگ ہو۔ پانچ فیصد ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے ہر حالت میں نیکی پر قائم رہنا ہوتا ہے خواہ کچھ ہو جائے۔ بقول غالب"

ہے موجِ خون سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا ؟

پانچ فیصد ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے بُرے ہی رہنا ہوتا ہے چاہے کچھ ہو جائے انہوں نے برائی کو چھوڑنا نہیں ہوتا۔ باقی ۸۰ یا ۹۰ فیصد لوگ جو ہیں وہ ایسے ہیں کہ جو رنگ زمانہ اختیار کرتا ہے یہ اسی میں رنگے جاتے ہیں۔ اگر نیکی کا رنگ غالب ہو گا تو یہ لوگ نیکی اختیار کریں گے اور اگر بدی کا رنگ غالب ہو گا تو یہ بدی کی طرف مائل ہو جائیں گے۔

اگلی بات میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ مثلاً جمنازیم میں ایک موٹا رسا ہوتا ہے جس کو پکڑ کر ورزش کرنے والے اوپر کو چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوپر چڑھنے میں محنت کی ضرورت پڑتی ہے زور لگانا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ورزش کرنے والا اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کر دے تو خود بخود نیچے پھسلتا جائے گا۔ اگرچہ سچائی کی محبت ہر دل میں موجود ہے۔ مگر سچائی کو اپنانے کا جو کام ہے اس پر عمل کرنے کا جو کام ہے اس میں زور لگتا ہے تو اس کے لیئے کوشش درکار ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص لوگوں کو برائی کی طرف مائل کرے تو پھر صرف گرفت ڈھیلی چھوڑنے کی ضرورت ہے اس پہ لوگ فوراً تیار ہو جائیں گے اور سارے کے سارے ادھر کو بھاگ اٹھیں گے۔

اب میں جناب رسول پاکؐ کے دور مبارک کی مثال پیش کرتا ہوں حضور اکرمؐ کی شخصیت ایسی مکمل تھی کہ آپؐ جیسی نہ کوئی اور شخصیت تھی نہ ہے اور نہ ہو گی۔ حضورؐ نے اپنی زیر تربیت ایسی شخصیتوں کی تربیت کی جو سارے کے سارے سُپرمین Superman تھے۔ آپ دنیا میں اور کہیں نہیں دیکھیں گے کہ کسی بڑی شخصیت کے زیر تربیت بڑے لوگ پیدا ہوئے ہوں اور اتنی بڑی تعداد میں پیدا ہوئے ہوں جتنے حضورؐ کی زیر تربیت پیدا ہوئے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار یا چوالیس ہزار اور پھر آنحضورؐ نے ان کو اللہ تعالےٰ کے رنگ میں بھی رنگ دیا۔ لیکن ساتھ ہر ایک کی جو انفرادی صلاحیت تھی اس کو بھی چمکا دیا۔ یہ نہیں کہ سب ایک ہی جیسے ہوں جیسے مثلاً بدھ مت کے پیروکار، یا عیسائیوں کے پیروکار، یہاں یہ

بات نہیں۔ کوئی بہت بڑا جنرل ہے کوئی بہت بڑا منتظم ہے کوئی بہت بڑا مدبر ہے۔ کوئی بہت بڑا سیاستدان ہے لیکن سب کے سب اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں سب سچائی کی محبت میں رنگے ہوتے ہیں۔ انجینئر بھی باکمال۔ سامان عمارت بھی نہایت اعلیٰ قسم کا۔ پھر ان کی مدد سے آنحضورؐ نے ایک مثالی معاشرہ اور ایک مثالی مملکت قائم کر کے دکھا دی اور یہی تکمیل نبوت ہے آپ تمام انبیاء پر نظر ڈال لیں ہر نبی کی بنیادی تعلیم یہی رہی ہے توحید اور آخرت۔ لیکن توحید اور آخرت پر مبنی معاشرہ اور مملکت صرف آنحضورؐ نے قائم کر کے دکھائی۔ آج بھی ہم اگر یہ کام کریں گے تو اسی صورت میں۔ ہاں ایک اور بات مجھے یاد آگئی کہ ہمارے لوگ آج کل یہی بات کہتے رہتے ہیں کہ جی ابھی پرسچ نے وہ شخصیتیں گھڑنی ہیں یا تیار کرنی ہیں کیونکہ ہم ابھی ملکی دور میں ہیں حالانکہ میری ناچیز رائے میں اس وقت ملک کے اندر جتنے اچھے آدمی ہیں اور ہیں ضرور۔ دس کروڑ کی ہماری آبادی ہے اس میں سے دس لاکھ نہ سہی ایک لاکھ تو نکل ہی آئیں گے ایک لاکھ بھی نہ ہوں ایک ہزار ہی سہی۔ جو سچائی پر جان دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اتنی تحریکیں یہاں چلی ہیں اگرچہ ہر تحریک کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا۔ لیکن عوام نے قربانیاں دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ نہ جان کی اور نہ مال کی۔ تو اگر اب بھی سچائی کے نام پر کوئی شخص اٹھے بشرطیکہ اُسے عوام کا اعتماد حاصل ہو اور وہ عوام کے اندر ایک ولولہ پیدا کر سکے۔ اس وقت جتنے بھی اچھے آدمی ہیں ـــــ ہمیشہ اقلیتیں ہی حالات بدلتی ہیں۔ حالات کو کبھی اکثریتیں تو نہیں بدلتیں۔ جب کبھی کوئی تحریک اٹھی ہے تو اقلیتوں نے ہی اٹھ کر حالات کو بدلا ہے تو آج بھی اس ملک کے اندر کم از کم دس ہزار آدمی ایسے موجود ہیں اگر کوئی ان کو اکٹھا کر لے اور ان کے ذریعے سچائی کی بالادستی قائم کرنا چاہیئے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور صرف آنحضورؐ کی اتباع پیش نظر رکھے تو ملک کے حالات بدل سکتے ہیں۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت بہت سے حلقوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے بلکہ چٹکیاں لے رہا ہے کہ پھر ایسا کیوں نہیں ہو رہا ہے کیوں حالات نہیں سدھرتے

کیوں ہم جانتے ہوئے بھی زوال کی طرف جارہے ہیں کیوں ہم اپنے آپ کو نہیں سنبھالتے۔ تو میرے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے کہ جو لوگ اس وقت برائی سے بچے ہوئے ہیں۔ رشوت دینے سے بچے ہوئے ہیں ظلم نہیں کرتے کسی کا ناجائز حق نہیں مارتے۔ وہ سب اکٹھے ہوں اور ان کا نعرہ یہ ہو نہ ظلم کریں گے اور نہ کرنے دیں گے، نہ رشوت لیں گے نہ لینے دیں گے، نہ ناانصافی کریں گے نہ کرنے دیں گے۔ اس قسم کے نعروں کے ساتھ ایک جماعت سامنے آئے۔ اور یہ جو آجکل کی روائتی سیاسی پارٹیاں ہیں جو بے حد اخراجات کرتی ہیں۔ جو five star ہوٹل میں اپنی میٹنگ کرتی ہیں۔ بڑے بڑے جلسے اور بڑے بڑے جلوس اور لوگوں کو صرف ہنگامہ آرائی پر اکساتی ہیں اُن کو صرف نعروں پر خوش کرتی ہیں ان سے الگ ہٹ کر اللہ والوں کی ایک جماعت آجائے تو خواہ وہ تھوڑے سے ہوں وہ انشاءاللہ العزیز حالات کو ضرور بدل دیں گے۔

میاں عبدالرشید

محترمی ڈاکٹر غلام حسین اظہر صاحب

جناب عالی، آپ تنقید، تحقیق، تخلیق اور ادب کے ان تینوں شعبوں میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں یہ حیثیت آپ کو اپنے اس طویل ریاض کی بدولت حاصل ہوئی ہے جو آپ نے ان تینوں شعبوں میں سالہا سال روا رکھا ہے۔ بحیثیت محقق آپ نے صدیوں کے علمی خزانوں کو کھنگالا ہے۔ بحیثیت نقاد آپ نے مختلف النوع فن پاروں کو پرکھا، جانچا اور ان کے حقیقی فنی مرتبے کا تعین کیا ہے۔ بحیثیت تخلیق کار آپ نے ہمیں نہائیت ارفع درجے کے شعری فن پاروں سے نوازا ہے۔ یوں ہم آپ کی ذات کو ایک واجب احترام درخشاں فنی تثلیث قرار دے سکتے ہیں۔ آپ نے مدتوں بطور استاد نئی نسل کی فکری، جذباتی اور تہذیبی آبیاری بھی کی ہے۔ اور پھر ایک مؤقر تعلیمی ادارے کے سربراہ کے طور پر اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور اعتراف بھی کروایا ہے یوں بھی ایک ہمہ صفت موصوف انسان کے طور پر اپنے تمام جاننے والوں سے بے پایاں عزت و توقیر بھی پائی ہے۔ لہذا میں بجا طور پر آپ سے آرزو مند ہوں کہ آپ میرے سوال کا سیر حاصل جواب فراہم کرکے مجھے اور میرے قارئین کو اپنی رہنمائی کا اعزاز بخشیں گے۔

غیاث چودھری

یہ سوال اپنی جگہ بڑا اہم ہے کہ انسان نے ہمیشہ یہ خواہش کی ہے کہ وہ حق و صداقت کا ساتھ دے۔ زندگی میں حق و صداقت کی اقدار کی حکمرانی ہو لیکن جب ہم تاریخ انسانی پہ نظر ڈالتے ہیں تو یہ گمان گذرتا ہے کہ ہر دور میں حق اور سچائی کی خاطر جینے والے افراد بہت کم نظر آتے ہیں آپ کے سوال میں آپ نے زور بھی اسی بات پر دیا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ سچ کی راہ پر چلنے والے ہمیشہ اور ہر دور

میں کم رہے ہیں۔ واقعی یہ امر سوچنے والے ذہنوں کو ہمیشہ پریشان کرتا ہے۔
کہ آخر ایک حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود اس حقیقت کے ماننے والے، اس
کی پیروی کرنے والے اس کی راہ پر چلنے والے، ہمیں کم کیوں دکھائی دیتے
ہیں اصل بات یہ ہے کہ ہر دور میں سچائی کی علمبرداری کے لیے جن مصیبتوں اور
صعوبتوں سے انسان کو گذرنا پڑتا ہے ان کو برداشت کرنا ہر کسی کے بس کی بات
نہیں ہے انسانی مفادات کی خاطر جینے والے لوگ کثرت میں نظر آتے ہیں اور
اجتماعی فلاح و بہبود کی خاطر جینے والے کم ہیں کیونکہ دوسروں کی خاطر جینا، حق کی خاطر
جینا، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ اپنی ذات کو منہا کرکے، اپنی ذات کی قربانی دے کر اپنی
ضروریات کو کم کرکے، دوسروں کی خاطر جیئیں۔ اس میں جس ایثار اور قربانی کی ضرورت
ہے وہ بہت کم لوگوں کے اندر موجود ہوتی ہے اسی لیئے ہمیں بظاہر حق کی خاطر
جینے والے بہت کم نظر آتے ہیں لیکن اگر ہم غور کریں تو یہ بات بھی ماننی پڑے گی
کہ مجموعی طور پر کسی دور میں بھی حق وصداقت اور خیر کی قوت کو کسی نے بھی اس اعتبار سے
چیلنج نہیں کیا کہ یہ حق وصداقت نہیں ہے انسانی ضمیر اور دل و دماغ ہمیشہ اس چیز کو تسلیم
کرتا رہا ہے کہ جو سچ ہے اس کو وہ اگر زبان سے نہیں اور عمل سے نہیں تو کم از کم دلی طور پر
ضرور اچھا محسوس کرے۔ اس راہ سے گذرتے ہوئے جو صعوبتیں درپیش ہوتی ہیں
وہ ہمیشہ اس راہ سے گذرنے والوں کے لیے رکاوٹیں بنتی رہی ہیں۔ انسان کو حق وصداقت
پر کس حد تک یقین ہے اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے آنحضور صلعم سے جب یہ پوچھا گیا
کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ تو آنحضرت صلعم نے انتہائی مختصر الفاظ میں اور انتہائی معنی خیز
الفاظ میں یہ فرمایا کہ برائی وہ ہے "ماحاک فی نفسک" کہ جس بات کی کھٹک تم اپنے
دل میں محسوس کرو وہ برائی ہے اور جس چیز کو کرتے ہوئے تمہیں اطمینان قلب نصیب ہو وہ
نیکی ہے یہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ ہم اسے جھٹلا نہیں سکتے لیکن اگر آنحضور صلعم کے
دور ہی کو دیکھا جائے تو اس پر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ حق وصداقت کا ساتھ دینے والے
بہت کم تھے اور جو تھے ان پہ بیتی وہ داستان اتنی دردناک ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے

اس پر غور کرتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں حق وصداقت کی خاطر خود سرورِ کائنات صلعم کو جن مشکلوں سے گذرنا پڑا ان میں طائف کا مرحلہ ہو یا ہجرت کا مرحلہ یا اس کے بعد کی جنگیں ان تمام مراحل کو ہم سامنے رکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں چند لوگ ہی آپ کے ساتھ آئے اور باطل کی جتنی قوتیں تھیں وہ مدمقابل رہیں اور آہستہ آہستہ کئی سالوں کی محنت کے بعد فتح مکہ کی صورت میں جب حق کا غلبہ ہوا تو بہت سے لوگ جو متردد تھے جن کے دل آپؐ کے ساتھ تھے لیکن وہ قربانی وایثار سے گریز کر رہے تھے، وہ بھی آپؐ کے ساتھ آن ملے ۔ اسی طرح قرآن حکیم کو اور دیگر تمام اہم کتب جو مختلف ادوار میں لکھی گئیں ان کو اگر ہم دیکھیں اور تاریخ انسانی پر نگاہ دوڑائیں تو اس وقت بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر حق کی راہ میں رکاوٹ بنا رہتا ہے اس کو چیلنج کرنا آسان نہیں ہوتا اس کو چیلنج کرنے والا کبھی تو تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے کبھی پس دیوارِ زنداں پھینک دیا جاتا ہے کبھی شعب ابی طالب سے گذرنا پڑتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے حواری بھی ان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ان کی امت کے اکثر افراد یہ کہتے تھے کہ جہاں تک باطل قوتوں کے خلاف جنگ کا تعلق ہے وہ آپ کریں یا آپ کا خدا کرے، ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں تو فرعونی قوتوں سے ٹکرانے کے لیے بھی ایک بہت بڑی محنت کا مرحلہ درکار تھا جس سے وہ گریز کرتے رہے اور اسی طرح ہم جوں جوں آگے بڑھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ صرف انبیاؑ ہی کو نہیں بلکہ ان سے کم تر درجے کے جو لوگ ہیں ان کی سائنسی صداقت کو بھی منوانے میں اپنی جانوں کی قربانیاں دینی پڑیں تو یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے کہ انسان آسانی کے ساتھ اس راہ پر چل نہیں سکتا ۔ اس لیئے حق وصداقت کا ساتھ دینے والے کم نظر آتے ہیں ۔ تاریخ اسلام ہی کو دیکھ لیجئے کہ جب خلافت کو ملوکیت میں بدلا جا رہا تھا ایک بنیادی صداقت کو جھٹلایا جا رہا تھا تو یزید کے مقابلے میں آنے والے افراد بہت کم تھے ۔ لوگوں کے دل امام حسینؑ کے ساتھ تھے لیکن ان میں سے اکثر کی تلواریں یزید کے ساتھ تھیں اور امامؑ کے خانوادے کے چند افراد نے عظیم قربانی

دے کر حق و صداقت کی راہ اختیار کی اور حق کی علمبرداری کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس کے بعد عباسی دور میں دیکھ لیں۔ امام احمد بن حنبلؒ ہوں۔ امام ابو حنیفہؒ ہوں۔ امام مالکؒ ہوں ان سب کو قید و بند کی صعوبتوں سے گذرنا پڑا بلکہ اس کے بعد بھی جب ہم برصغیر کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی زندان کی صعوبتوں سے گذرنا پڑا ـــــ تو حق و صداقت کی راہ کی بنیادی شرط یہی ہے کہ جو راہ ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گذر کر جاتی ہے، اس مقتل سے گذرنا، اپنی ضروریات کو کم کرنا، اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا۔ اپنے اعزا کو تکلیف میں ڈالنا ـــــ

یہ سب باتیں کوئی اتنی آسان نہیں ہیں اس لیئے قرآن حکیم نے کہا ہے کہ ایمان کا اور صداقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ حق و صداقت پر ایمان لائیں اور اس کے بعد استقامت کی راہ اختیار کریں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جو لوگ جس بات کو ماننے والے ہیں کہ ہم حق کو مان رہے ہیں انہیں اس چیز کے لیے تیار رہنا چاہیئے کہ انہیں مختلف طریقوں سے آزمایا جائے گا اس میں ان کے مال کا نقصان ہو گا، جان کا نقصان ہو گا۔ کھیتی باڑی کا نقصان ہو گا۔ ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد صرف چند لوگ ہوں گے جو اس معیار پر پورے اتریں گے اور پھر ان کے لیئے یہ بشارت ہے اسی بات کو سورہ توبہ میں اسی انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجیئے کہ اگر تمہیں اپنے آباؤ اجداد اپنے مال و متاع، اپنے محلات، اپنے کاروبار، یہ سب چیزیں خدا اور اس کی ذات سے زیادہ عزیز ہیں تو پھر اس وقت کا انتظار کرو جب اللہ تعالیٰ تمہارے خلاف فیصلہ دے۔ اس سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حق و صداقت کی راہ میں انسان کو تمام باطل قوتوں کے خلاف ٹکرانا پڑتا ہے اور اس میں جانی، مالی ہر قسم کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی بات کہلوائی گئی کہ حق و صداقت کا مقصد یہ ہے کہ انسان خدا کی راہ میں اپنی عزیز ترین متاع یعنی اپنے بیٹے کو بھی قربان کر دے اور الفاظ یہ کہلوائے گئے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ ۔۔۔۔۔۔۔
آپ کہہ دیجیئے میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ کے لیئے

ہے تو حق وصداقت کے لیئے یہ ضروری ہے کہ انسان تمام کائنات کی چیزوں سے منہ موڑ کر صرف حق کی علمبرداری کی خاطر جیئے اور اسی کی خاطر مرے اس میں وہ اگر جان کی قربانی بھی دے دیتا ہے، بظاہر شکست بھی کھاتا ہے تو یہ شکست بھی عارضی ہوتی ہے ہمیشہ رہنے والی چیز حق وصداقت کی اقدار ہیں اسی لیئے ہم دیکھتے ہیں کہ حق وصداقت کی کربلا میں جنگ جو ہے۔ اس میں حق کی قوت نے بظاہر شکست کھائی ہے لیکن عملاً یہ ہوا کہ شکست تو یزید کی تھی باطل کی تھی اور یہ قربانی زندگی بھر اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک مشعل راہ ثابت ہوئی۔ اسی لیے اقبال نے یہ کہا تھا کہ حق وصداقت کی دو علامتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں ایک علامت تو ہمیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی صورت میں نظر آتی ہے یہ دین کی ابتدا ہے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ انسان امام حسینؑ کی طرح اپنا مال، اپنی جان، اپنی اولاد، اپنے تمام عزیز و اقارب کو حق وصداقت کی خاطر وار دے۔ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے اور ان اقدار کی علمبرداری کے لیئے اتنی بڑی قربانی دینا انتہائی مشکل کام ہے اسی لیے اکثر افراد تاریخ انسانی میں اس طرح جیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ حق وصداقت کی طلب تو رکھتے ہیں لیکن اس کے لیے لڑنے کی طاقت ان کے اندر نہیں ہوتی وہ اس راہ پر چلتے ہوئے ان تمام آزمائشوں سے نہیں گذر سکتے جو اس کے لیئے ضروری ہیں لیکن اس سے ہمیں یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے کہ شاید انسان کے اندر سچائی کی طلب نہیں ہے حق کی طلب نہیں ہے حق اور سچائی کی طلب اس کے اندر موجود ہے اور اسی کی وجہ سے ہر دور میں وہی افراد زندہ رہے۔ اور انہی افراد کو ہم تاریخ کا حصہ سمجھتے ہیں اور انہی کا احترام اور انہی کا تقدس زندگی میں باقی رہا ہے جو حق کی خاطر جیئے اور حق کی خاطر مرے۔ اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے جو ہمیں تاریخ انسانی میں نظر آتی ہے، ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ اگر ہم حق کی بات کہتے ہیں، حق کا غلبہ چاہتے ہیں تو ہمیں کم و بیش کی پروا کیئے بغیر حق کی خاطر جینا ہے اور حق کی خاطر ہی مرنا ہے یہ تمام عارضی بیانات غلط ہیں حقیقت یہی ہے اس کی تلقین نبی کریم صلعم نے ان الفاظ میں کی کہ اگر تم برائی کو

دیکھتے ہو تو اس برائی کو مٹا دو اپنے ہاتھ سے، اگر اس سے نہیں مٹا سکتے تو اپنی زبان سے مٹانے کی کوشش کرو اگر یہ بھی تمہیں توفیق نہیں ہے تو پھر اسے اپنے دل میں برا سمجھو اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ یہ مرحلہ یہ صورت دین کی آخری صورت ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم برائی کے خلاف انسان کے دل میں نفرت ضرور رہنی چاہیئے حق سے محبت موجود رہنی چاہیئے جس سوسائٹی میں یہ چیز ختم ہو جائے وہ سوسائٹی زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ انسانی سوسائٹی کا، انسانی معاشرے کا، انسانی بقا کا انحصار اسی بات پر ہے کہ اگر سبھی لوگ نہیں تو کم از کم چند لوگ حق و صداقت کی ترجمانی کرتے رہیں ورنہ وہ قوم جو مجموعی طور پر اس راہ سے ہٹ جائے وہ زندگی میں نہ باقی رہ سکتی ہے اور تمام مادی آسائشیں بھی اسے زندہ نہیں رکھ سکتیں اور بالآخر اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیتی ہے عارضی طور پر بھی بہت سے ایسے مرحلے آتے ہیں جن میں ہم کبھی کبھار یہ دیکھتے ہیں کہ طاغوت کی قوتیں چھائی ہوئی ہیں لیکن ان کا یہ دور انتہائی عارضی اور چند روزہ ہوتا ہے۔ انسان "سواء السبیل" کی طرف بالآخر لوٹ کے آتا ہے۔ مختلف مراحل میں اس سے کوتاہیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کے اندر حق اور خیر کی جو تڑپ ہے وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اسے معاشرہ بگاڑتا ہے۔ مختلف حالات ایسے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی بات کے بارے میں انسانی فطرت پر تبصرہ کرتے ہوئے آنحضور صلعم نے کہا تھا کہ انسان فطرتِ سلیم لیکے پیدا ہوتا ہے اس کے والدین اسے مختلف راہوں پر ڈال دیتے ہیں اس کو یہود بنا دیا جاتا ہے کچھ کو نصاریٰ بنا دیا جاتا ہے۔ بظاہر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ان تمام قوتوں کے تحت وہ حق سے ہٹ گئے ہیں لیکن فطرت سلیم اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان حق اور سچائی کی راہ کی طرف بڑھے اور پھر لوٹ کر ہم اسی راہ پر آتے ہیں۔ جس کو ہم "سواء السبیل" کہتے ہیں تو یہ "سواء السبیل" کی تلاش، اس کی طلب، یہ دراصل حق اور سچائی کی طلب ہے اور جب تک انسانیت باقی ہے اس کے اندر سچ کی خاطر جینے کی طلب باقی رہے گی اور اسی کی وجہ سے ہی انسان کا قدم آگے بڑھتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ

برائی کی قوتوں کو ڈھاتا چلا جاتا ہے جب کسی سوسائٹی میں نیکی کی قوتیں بڑھ جاتی ہیں
تو اس کے اندر آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی برائیاں بھی مٹنا شروع ہو جاتی ہیں اس کے لیئے
یہ ضروری ہے کہ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنا سب کچھ
صداقت کی خاطر وار سکیں اور آئندہ بھی انسان کا مستقبل انہی لوگوں سے وابستہ ہے
جو اجتماعی فلاح و بہبود کی خاطر اپنی ذات کی آسائش کی قربانی دے سکیں ۔ مومن کی
بنیادی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر، مشکلات میں
ڈال کر دوسروں کے لیئے ایثار و قربانی سے کام لیتا ہے یہی ایثار و قربانی حق و
صداقت کی راہ کی بنیادی شرط ہے اور اس راہ پر چلتے ہوئے ہمیں یہ سوچنا چاہیئے
کہ یہ سکھ کی راہ نہیں ہے بلکہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کٹھن راہ میں اٹھنے والا
ہر قدم ہمیں بھی آگے بڑھائے گا اور انسانیت کو بھی آگے کی طرف لے جائیگا۔

ڈاکٹر غلام حسین اظہر
پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج۔

محترمہ کشور ناہید صاحبہ

جناب عالیہ! آپ برصغیر کے ان قد آور فنکاروں میں سے ایک ہیں جن کی اپنی ایک الگ اور خاص شناخت ہے آپ نے ایک منفرد اسلوب میں بڑی مؤثر اور دلآویز شاعری کی ہے جسے بجا طور پر احتجاجی لہجے کی ایسی شاعری قرار دیا گیا ہے جس کے ذریعے مشرق کی مظلوم صنفِ نازک کو اردو شعر و سخن میں بھرپور نمائندگی ملی ہے۔ آپ نے بجا طور پر انسانی حقوق کے لیئے اور خاص طور پر خواتین کے چھنے ہوئے حقوق کی بازیابی کے لیئے عملی جد و جہد کی ایک درخشاں مثال قائم کی اور اس سلسلے میں بہت ساری صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ آپ نے ایک مؤقر ادبی جریدے کے توسط سے عصری رویوں کو بھی مثبت طور پر متاثر کیا۔ اپنی کارکردگی کے ہر میدان میں آپ کی آواز ہمیشہ نہ صرف دلاور انہ رہی ہے بلکہ دوسروں کے لیئے حوصلہ بخش بھی رہی ہے آپ کی صداقت دوستی کا برملا اعتراف ان لوگوں نے بھی کیا ہے جنہیں آپ کے نظریات و خیالات سے ہمیشہ ہی اختلاف رہا ہے اسی فکری تناظر میں میں توقع کرتا ہوں کہ آپ میرے سوال کا جواب فراہم کر کے بہت سوں کو جرأت مندانہ رہنمائی کی عزت بخشیں گی۔

غیاث چودھری

آپ کا یہ سوال کہ سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں کم کیوں ہے جب کہ ہر کوئی سچ ہی کا حامی یا دعویدار ہے یہ سوال منفی نقطہ نظر کی زیادہ وضاحت کرتا ہے۔ سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں کم نہیں ہے دکھائی کم دیتی ہے اور دیکھنے والے کو اپنی آنکھ اور نقطۂ نظر کے مطابق چیز دکھائی دیتی ہے۔ تلاش مقصود بالذات نہیں ہوتی مقصود بالعمل ہوتی ہے اگر ہم چنا بوئیں گے تو گندم نہیں کاٹ سکتے

اگر جھوٹ بولیں گے تو جھوٹ ملے گا، جن ذہنوں میں، جن ارادوں میں اور جن مقاصد میں سطحیت ہوتی ہے تو وہاں پر سچ واقعی آپ کو نہیں ملتا کیوں کہ سچ کے لیے اتنی ہی ریاضت چاہیئے جتنی ریاضت کے بعد زندگی میں پیغمبری حاصل ہوتی ہے اب پر سچ کے ساتھ آپ پیغمبری کو اکٹھا کرنے سے چاہیں کہہ سکتے ہیں کہ ناممکن الحصول بات کو آپ سچ کہہ دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کئی صدیاں کوئی پیغمبر نہیں ہوتا تو کئی صدیوں تک آپ کا سچ کو تلاش کرنا بھی بے کار ہے ۔ میں یہ نہیں کہہ رہی ۔ پیغمبر سے مراد صرف وہ مصلحین نہیں ہیں کہ جنہوں نے مذہب کی بنیاد رکھی بلکہ پیامبر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو نئی تحریک لے کر اٹھے اور نئی بنیاد حیات کے لیے کام کرے کیونکہ دنیا کو آگے بڑھانے کا منصوبہ اس کے سامنے ہوتا ہے ۔ایسا شخص چاہے گلیلیو کی شکل میں آئے چاہے ابن الہیثم کی شکل میں آئے چاہے آئن سٹائن کی شکل میں آئے اور چاہے آپ اس کا نام عبدالسلام رکھ دیں ۔

مراد یہ ہے کہ یہ سب نام جو میں نے آپ کے سامنے لیئے ہیں یہ سب سچ کے symbols ہیں لوگ ان symbols کو اس لیئے یاد رکھتے ہیں یا سچ کی قدر کرتے ہیں کہ ایک شخص، ایک واقع، ایک تاریخی تناظر، ایک انسان، ایک دماغ ہوتا ہے جو تاریخ سے آگے دیکھ کر چلتا ہے سچ اسی زمرے میں آتا ہے ۔ سچ کبھی علیؓ بنتا ہے کبھی عیسیٰؑ بنتا ہے کبھی رسولؐ بنتا ہے کبھی قائد اعظمؒ بنتا ہے کبھی مہاتما بدھ بنتا ہے اور اسی طرح تاریخی تناظر میں وہ آگے چل کر ویتنام کی آواز بنتا ہے اور کبھی فلسطین کی آواز بنتا ہے یونائیٹڈ نیشنز میں اگر ۱۹۱ ممالک ایک قرارداد کو سپورٹ کرتے ہیں تو وہ سچ کی آواز ہوتی ہے لیکن جھوٹ کی ایک آواز جو امریکہ کی آواز ہے اسے ویٹو کر کے ختم کر دیتی ہے تو اس طرح سچ ختم تو نہیں ہو جاتا ۔ تو یہ جتنے سچ ہیں یہ کم ہی ملیں گے تو آپ کو سچ کے معیار کی سند ملے گی اگر سچ عام ہو جائے گا تو پھر آپ سچ تلاش کرنے کب نکلیں گے ؟

کشور ناہید

ڈائریکٹر ، اردو سائنس بورڈ

محترم ڈاکٹر مبشر حسن صاحب

جناب عالی، آپ ایک وسیع النظر ترقی پسند دانشور ہیں اور ایک اعلیٰ پائے کے استاد بھی ہیں۔ آپ وفاقی حکومت کے سینیئر وزیر رہ چکے ہیں آپ کو انسانی زندگی کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی شعبہ جات میں وسیع تجربہ حاصل ہے۔ آپ نے عوام الناس کے تمام طبقوں کی بود و باش کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ آپ نے اپنی عہد ساز کتاب "شاہراہِ انقلاب" کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کے لیئے ان راستوں کی نشاندہی کی ہے جن پر چل کر وہ بالآخر اس شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں جس کی آخری منزل ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت عمرانی انقلاب قرار پائی ہے۔ آپ کو صحیح معنوں میں پاکستان پیپل پارٹی کا ذہن قرار دیا جا سکتا ہے۔ یوں بھی آپ بحیثیت ایک فاضل استاد کے انسانی کردار و سیرت کو نئے تہذیبی سانچوں میں ڈھالنے کا فن جانتے ہیں اس لیئے میں بجا طور پہ توقع کرتا ہوں کہ آپ میرے سوال کا جواب عنایت کر کے متعلقہ سلسلے میں ایک بالغ نظر رہنما کا کردار ادا کریں گے۔

غیاث چودھری

دیکھیں غیاث صاحب!۔ آپ کے سوال میں ایک ابہام ہے اور وہ یہ ہے کہ جو معنیٰ آپ بہ سچ کے لے رہے ہیں اس میں آپ اچھائی کا تصور بھی شامل کر رہے ہیں آپ کے خیال میں سچ سے مراد نیکی بھی ہے آپ کے خیال میں سچ سے مراد پاکی بھی ہے تو پھر جو بات آپ کہہ رہے ہیں اس کو انگریزی میں Truth کہتے ہیں

یعنی کیپیٹل ٹی کے ساتھ Truth تو فلسفے میں جھگڑا پڑ جاتا ہے کہ کیپیٹل ٹی کے ساتھ Truth اور Good کیپیٹل جی کے ساتھ ان دونوں میں فرق ہوتا ہے یا نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا سوال یہ ہے کہ دنیا میں بدی کیوں ہے دنیا میں ظلم کیوں ہے دنیا میں جبر کیوں ہے دنیا میں جھوٹ کیوں ہے۔ حالانکہ سب لوگ جبر، جھوٹ اور بدی کے حق میں نہیں ہیں تو یہ ہے آپ کا سوال ایسا سوال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ بھولے ہیں آپ کو پوری طرح یہ علم نہیں کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں انسان کے اپنے فیصلے کی حیثیت اتنی زیادہ نہیں ہوتی جتنا کہ وہ دعوہ کرتا ہے آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہر کسی بات سے پہلے انسان کی ضرورت مقدم ہوتی ہے اس کے کھانے کی ضرورت اس کے پہننے کی ضرورت، اس کی رہائش کی ضرورت، اس کے علاج کی ضرورت، اس کی حفاظت کی ضرورت اور یہ سب چیزیں حاصل کرنے کے لیئے موجودہ نظام کے تحت کسی کو کسی کے پاس کام کرنا پڑتا ہے یہ جو سب لوگ کام کرنے والے ہیں اور کروانے والے ہیں انہوں نے اس کاروباری نظام کو چلانے کی خاطر ایک فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ سب حکومت کے تابع ہوں گے اور حکومت کے لیئے انہوں نے ایک ریاست بنائی ہوئی ہے جس کے سب لوگ تابع ہوتے ہیں اگر ریاست نہ ہو تو پیداوار کا کام نہیں چلے گا۔ اور اگر پیداوار ہی نہیں ہوگی تو لوگوں کو بنیادی ضروریات نہیں ملیں گی تو اس صورت میں عملداری ان کی ہوگی جن کی ریاست پر عملداری ہے اور ریاست پر عملداری ان کی ہے جن کے حکم پر پولیس چلتی ہے جن کے حکم پر مجسٹریٹ چلتا ہے جن کے حکم پر جیل خانے چلتے ہیں اور جن کے حکم پر ہمیں ٹیکس دینے پڑتے ہیں۔ لہٰذا عملداری ریاست کی ہوتی جب کہ ریاست کی مشینری میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو تاریخی طور پر مقدم رہے ہیں، معتبر رہے ہیں، چودھری رہے ہیں، اور نظام حکومت بھی وہی بناتے ہیں۔ اور پھر جتنے بھی ذرائع پیداوار ہیں۔ جیسے ریلوے ہے، بجلی ہے انڈسٹریز ہیں ان کے بھی وہ لوگ مالک ہوتے ہیں کیونکہ حکومتی اداروں کے سربراہ ہوتے ہیں اور جو ذرائع پیداوار نجی ملکیت میں ہیں ان میں سے باقیوں کو چھوڑ کر

زمین کی مثال لے لیں۔ جو لوگ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک ہیں وہ خود تو کام کرتے نہیں۔ مزارعوں سے کرواتے ہیں یا مزدوروں سے کام کرواتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مالک بہت زیادہ امیر اور مزدور بہت زیادہ غریب رہتے ہیں اور مزدوروں کو اپنا غریب رہنا برا لگتا ہے وہ کہتے ہیں ہم ان امیروں کے لیئے کیوں کام کریں یہ ہم سے زیادہ حصہ لے جاتے ہیں۔ پھر ایک اور بات جو سارے ہی لوگ کہتے ہیں کہ کام کر کے کیا کمانا ہے ویسے ہی کماؤ یعنی لوٹ لو، رشوت لے لو اور جو لوگ رشوت لے کر امیر بن جاتے ہیں ان کی سب جگہ عزت ہوتی ہے وہ ایم۔ این۔ اے خود بھی بن جاتے ہیں۔ اور دوں کو بھی ایم۔ این۔ اے بنوا دیتے ہیں اور سمگلنگ کر کے بھی لوگ امیر بن جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب آپ کا نظام حکومت اور نظام ملکیت ایسا ہو کہ دنیاوی کام چلانے کے لیئے روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، علاج اور دوسری ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے لیئے جب اتنی گنجائش نہ ہو کہ محض قانون پر چلا جائے بلکہ جبر کرنا پڑے اور قانون سے ہٹ کر کام کرنا پڑے تو آپ ہی بتائیں کہ ایسے نظام میں تو یہ سوال فضول ہی لگتا ہے کہ سچ کی عملداری کیوں نہیں ہے پھر آپ کا یہ کہنا کہ لوگ جھوٹ کو برا کیوں کہتے ہیں تو وہ اس لیئے ہے کہ ان کو کسی نے سکھایا ہی نہیں ان میں ہمت نہیں۔ رشوت لیتے ہیں لیکن کہہ نہیں سکتے کہ وہ رشوت لیتے ہیں بدمعاشی کرتے ہیں اندر سے جانتے ہیں کہ برے ہیں مگر کہہ نہیں سکتے کہ وہ ایسا کرتے ہیں اور اس میں کوئی برائی نہیں سمجھتے شراب پیتے ہیں مگر چھپ کر پیتے ہیں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ ظاہری طور پر ایسا کریں۔ کیونکہ ان کی زندگی کا دارومدار سچ کے راستے سے ہٹ کر پیداوار کرنا ہے، اس کی غیر منصفانہ تقسیم کرنا ہے امیروں کو مزید امیر اور غریبوں کو کم سے کم دیتا ہے تاکہ وہ مریں نہیں، زندہ رہیں اور ان کے لیئے کام کرتے رہیں وہ غریبوں کو اپنے بیلوں بھینسوں کی طرح ہی سمجھتے ہیں اور انہیں زندہ رکھنے کے لیئے ویسا ہی برتاؤ کرتے ہیں تو اصل مسئلہ سچ کی عملداری کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ ریاست کی عملداری

کا ہے اصل مسئلہ اس ٹولے کے ریاستی نظام پر قابو رکھنے کا ہے کیونکہ وہ ٹولا نہ متقی ہے نہ پرہیزگار ہے نہ اسے خدا کا خوف ہے وہ تو اس نظام کو جاری رکھ کر مزید دولت و اقتدار چاہتا ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ تھوڑی مدت کی بات کے مقابلے میں طویل مدت کی بات ہونی چاہیئے اور فلسفۂ حیات کے حوالے سے بات ہونی چاہیئے لیکن آپ کی یہ بات بالکل صحیح نہیں ہے کیونکہ جس بات کا ہم عہد کرتے ہیں۔ اور وزیر بن کر جس بات کا حلف اُٹھاتے ہیں۔ مسلمان کی حیثیت سے مسجدوں میں عبادت کرتے ہیں۔ روزہ رکھ کر دعائیں مانگتے ہیں وہ سب لاگو ان ہی کے ہیں جن کے پاس طاقت ہے اگر سچ پر چلنے کا اتحاد ہے تو ماسوائے ان کے جو طاقت میں ہیں، باقی سب کا ہے۔ اب تھانیدار کو ہی لے لیجیئے اگر اس نے اپنی نوکری بچانی ہے تو وہ ہمارا ساتھ کیسے دے سکتا ہے وہ سچّے وعدے پر کیسے عمل کر سکتا ہے! فرض کریں "میں امیر آدمی ہوں میں نے اپنی زمین مزارعوں کو دے رکھی ہے میں اسمبلی کا ممبر بھی ہوں اور میں وزیر بھی ہوں —— تو میں او رساری باتیں کرنے کو تیار ہوں گا۔ لیکن میں یہ کرنے کو تیار نہیں ہوں گا اور میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا"۔ یہ صرف آپ کے ذہن میں ہے کہ ان لوگوں نے وعدے کیئے ہوئے ہیں انہوں نے صرف یہ آٹھ وعدے کیئے ہوئے ہیں کہ وہ موجودہ ظالمانہ اور جابرانہ نظام کو قائم رکھیں گے اور ترقی دیں گے اور جب تک یہ ظالمانہ اور جابرانہ نظام رہے گا —— یہ جو کاغذ پہ لکھا ہے سِں اور پچ ملا کر سچ تو یہ کاغذ کے ٹکڑے پر صرف ایک سیاہی کا دھبہ ہی رہے گا۔

ڈاکٹر مبشر حسن

محترم پروفیسر محمد منور مرزا صاحب

جناب عالی، آپ کی ذاتِ گرامی ہمارے ملک کے اُن گنے چُنے دانشوروں میں سے ایک ہے۔ جن کی پرمایہ اہلیتوں اور فضیلتوں کی کئی جہتیں ہیں۔ آپ ایک خیال انگیز اور قومی درد سے لبریز تقاریر کرنے والے مقرر ہیں۔ آپ ایک حساس دل و دماغ رکھنے والے شاعر ہیں۔ آپ ایک وسیع العلم اور قادرالکلام استاد ہیں۔ اقبالیات کے سلسلے میں آپ ایک مستند اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تحریکِ پاکستان کے فکری، تہذیبی اور عملی پہلوؤں پر آپ کی گہری نظر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ حق گوئی میں آپ کی بیباک اور نڈر ذات ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا میں ان تمام حوالوں کی روشنی میں اپنا پیچیدہ مگر نازک سوال آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں جس کا جو بھی جواب میسر آئے گا وہ یقیناً بے لاگ انداز میں بصیرت افروزی کے ساتھ بہت سے طالبانِ حق کی رہنمائی کرے گا۔

غیاث چودھری

پروفیسرانہ تنقید کے مظاہر میں سے ایک مظہر یہ رائے ہے کہ فن اپنے فنکار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہمیں باقی فنون کے تجزیئے کا موقع کم ہی ملا ہے البتہ جس فن کو شاعری کہتے ہیں اسے دیکھا بھی ہے پرکھا بھی ہے اور ابوالفضل کے اس قول کو "خویش را از نقش تا بہ نقاش یابد رسانید" شعر پر منطبق کر کے شاعر کی حیات و سیرت تک پہنچنے کی بھی کوشش کی ہے حق یہ ہے کہ اس باب میں عموماً نتیجہ قولِ ابوالفضل کے برعکس دیکھا، میں نے کہا ہے عموماً وہ اس لیئے کہ استثناآت کی گنجائش ہر موضوع حیات میں موجود رہتی ہے۔

شاعری میں وہ کلام بھی دیکھا جو بالکل رندانہ تھا۔ اور حضرت شاعر کو دیکھا تو بالکل

شریف آدمی، بھلے آدمی، بھولے آدمی، اور یہ بھی دیکھا کہ کلام میں بڑی حکمت آموز باتیں ہیں مگر عمل انتہائی غیر حکیمانہ بلکہ غیر شریفانہ، یہی عالم واعظین و ناصحین کرام کا ہے منبر پر یا مجلس، وعظ و تلقین میں وہ کچھ اور ہیں۔

چوں بہ ذات اندر روند یک فرد دیگر می شوند

اب یہاں دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی فرد کلماتِ خیر کہے اور نیک نیتی سے کہے اور کہتے وقت وہ واقعی مخلص بھی ہو۔ مگر جب عمل کا وقت آئے تو شکست کھا جاتے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی از روئے نیت بدکُن ہو اور دوسروں پر اپنی پاکیزگی اور خلوص کا رعب جھاڑ رہا ہو۔ یہ صریحاً دھوکہ دینے کا عمل ہے۔ اس میں منافقت پائی جاتی ہے اس طرح دیکھوں تو میرے نزدیک اکثریت ان لوگوں کی ہے جو منافق نہیں۔ وہ اپنی طرف سے خیر ہی کے علمبردار بننے کے خواہاں ہیں۔ اور خیر ہی پھیلاتے ہیں۔ ان کا ارادہ دھوکا دینے کا ہرگز نہیں ہوتا۔ ایسا شخص اگر شاعر ہے تو عین ممکن ہے اپنے شعر میں حکیمانہ مضمون قلمبند کرتے ہوئے اس کا دل اور ایمان اس کا ساتھ دے رہے ہوں۔ تاہم یہاں تعرض بدنیت اور بدارادہ لوگوں سے نہیں جن کا ضمیر دانستہ مجرم ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں تعرض ان افراد سے ہے جو حق کو حق مانتے ہیں اور حق ہی کے پاسدار بھی ہیں، خیر کے طالب بھی ہیں اور خیر دوسروں تک بھی پہنچانا چاہتے ہیں لیکن جب ذرا سا بھی آزمائش کا مرحلہ آتا ہے تو لڑھک جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے حق میں یہ کہنا ضروری نہیں کہ وہ بے علم یا ان پڑھ ہونے کے باعث ایسا کرتے ہیں۔ اگر وہ سرے سے بے علم اور ان پڑھ ہیں۔ اور ساتھ ہی عام سوجھ بوجھ سے عاری ہیں تو ان کا مسئلہ قدرے مختلف ہے مگر تماشا تو وہ اشخاص بنتے ہیں جو عقل و دانش کے اعتبار سے بھی عالی رتبہ ہوتے ہیں۔ اور علم و فضل کی رو سے بھی، نیز یہ کہ وہ بلند ترین مناصب پر بھی فائز ہوتے ہیں۔ وہ منصب استاد کا ہو، قاضی اور جج کا ہو یا کماندار و حکمران کا ہو، لیکن عمل کے وقت حق اور صداقت، نیکی اور بھلائی کی منزل سے لڑھکنا ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ سوال یہ

ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے آدمی خود اپنے قولِ خیر کے مقابل عملِ شر کا مرتکب کیوں ہوتا ہے۔ حق و خیر پر ایمان کے باوصف، ناحق اور باطل سے نفرت کے باوجود، یہ تجزیہ آسان نہیں ہے۔ آج نفسیات بہت ترقی کر گئی ہے۔ اور نفسیاتی تجزیے کے کارخانے بھی عام کھل گئے ہیں۔ مگر یہ مان لینا چاہیئے کہ آدمی محض مشینی نہیں کہ مشین کی گرفت میں پوری طرح آ جائے۔ تجزیئے تمیناً ہی کچھ فرماتے ہیں۔ اور وہ بھی حال کی حالت کے بارے میں، آدم جس تاریخ کا فرزند ہے وہ بڑی پر پیچ ہے، اسے دیکھیں تو یہ وجود قابلِ فخر بھی ہے یعنی "انسان عظیم ہے خدایا" اور حیرت ناک طور پر قابلِ ہمدردی یا لائقِ نفریں بھی یعنی یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا؟ تمام وہ معاشرے جن کے اخلاق کسی وحی شدہ کتاب اور کسی پیغمبر کی تعلیمات پر استوار ہیں ان کا ایمان ہے کہ خداوند کریم نے گو اولاد آدم کو عقل و دانش سے نوازا تاہم اسے اس کی اہلیت پر ہی نہیں چھوڑ دیا، عقل انسانی کو جب تک خالق کی جانب سے ہدایت میسر نہ آئے وہ محض امتحان و خطا کی تکرار سے وہ شے نہیں بن سکتی۔ جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانے پر قادر ہو۔ محض عقل و دانش کی مدد سے فرد انسانی کے اختیارات اور حدود کا تعین ناممکن ہے، نہ اپنی حدود کا پتہ نہ دوسروں کی حدود کا، نہ اپنے جائز حقوق کا علم نہ دوسروں کے حقوق کا، نہ حرام کی معرفت نہ حلال کی شناخت،

آدمی پیدا ہوتا ہے تو عام حیوانوں کی سطح پر، اس کا آغاز مادّی اشتہا سے ہوتا ہے لیکن عام دوسرے حیوان بہت جلد اپنی بدنی اور جبلّی پرورش پا جاتے ہیں جب کہ آدمی کو تربیّت یافتہ ہونے میں بہت وقت لگتا ہے۔ حیوانوں کی حیوانی تربیّت بدن اور جسم تک محدود ہوتی ہے اور تمام عمر اپنی جبلّتوں کی مدد سے گزار دیتے ہیں ——— ان کے مقابل آدمی کی بدنی اور جسمی تربیّت پر بھی زیادہ مدت صرف ہوتی ہے اور عقلی و روحانی تربیّت پر بھی، یہ تربیّت جسے عقلی و روحانی کہا جاتا ہے تمام عمر جاری رہتی ہے جسمی اور بدنی تربیّت

جتنی اتمام کو پہنچتی ہے اتنی ہی تیزی سے وہ زوال سے بھی دو چار ہونے لگتی ہے۔ پچیس تیس برس تک جوانی کی رعنائی رہتی ہے، اس کے بعد ٹھہراؤ، اور پھر زوال، اس کے مقابل عقلی اور روحانی تربیت تا دیر جاری رہتی ہے اس کی تکمیل ہو ہی نہیں پاتی ——— گویا آدمی نوع آدم کے حیوانی مدارج طے کر لیتا ہے عقلی، فکری، تہذیبی، اخلاقی، قلبی، اور وجدانی جوہر خام ہی رہتے ہیں۔ لہٰذا جسم کا پلنا اور شے ہے اور ہدایت یابی و معیارِ آدمیت پر پورا اترنا بالکل دوسرا معاملہ ———

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (سورۃ النور آیت نمبر ۴۵)

(اللہ نے ہر چلنے والے جانور کو کسی نہ کسی پانی سے پیدا کیا، پھر ان میں کچھ تو وہ ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں، کچھ ان میں وہ ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں، کچھ ان میں وہ ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں، اللہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے بیشک اللہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔)

عیاں ہے کہ اللہ نے پیٹ کے بل پر رینگنے والے، دو پاؤں پر چلنے والے، اور چار پاؤں پر چلنے والے جانوروں کا ذکر کیا ہے، اور اسی طرح یہ کہ وہ جتنے بھی جانور اور جیسے بھی جانور پیدا کرنا چاہے پیدا کر سکتا ہے اس لیئے کہ وہ اس پر پوری طرح قادر ہے مگر یہاں جو چیز قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے آدمی کو دو پایہ جانور کہا ہے۔ مراد ہے کہ از روئے خلقت وہ حیوانوں اور جانوروں کی ایک قسم اور نوع سے تعلق رکھتا ہے۔ محض پیدائش کی رو سے اسے کوئی واضح فضیلت دیگر جانوروں کے مقابل حاصل نہیں۔ اس کی فضیلت اس کی "انسانیت" میں مضمر ہے

اور وہ جوہر آسانی سے تربیّت یاب نہیں ہوتا ــــــــ

ایک اور امر جو اولاد آدم سے خصوصی تعلق رکھتا ہے وہ اس کا ایک خاص حد تک صاحب اختیار ہونا ہے، باقی ہر مخلوق تو اپنے اپنے انداز میں حق عبودیّت ادا کرتی ہے یا یوں کہیئے کہ فطرت نے جو فرض اس کو سونپا ہے اس کی ادائی میں مصروف رہتی ہے۔ لیکن آدم کو محض فطرت و جبلّت کا قیدی بنا کے چھوڑ نہیں دیا گیا تاکہ اب وہ فطری خطوط پر خود بخود چلتا رہے ــــــــ نہیں، ایسا نہیں، آدم کو اس کے بہت سے افعال کے باب میں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو قبول کرے چاہے رد کر دے یہ راہ اپنائے یا وہ، ٹھیک راہ چھوڑ دے اور غلط راہ پر پڑ جائے وہ غلطی سے بھی ایسا کر سکتا ہے اور جانے بوجھے بھی، یعنی اسے اس کے بہت سے افعال کا مسئول بنا دیا گیا ہے، اسے ذمہ دار بنا کر سزا و جزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے، اسی لیئے اسی سے پرسش ہوگی کسی جانور یا فرشتے یا نباتات و جمادات سے پرسش اعمال نہ ہوگی اس لئے کہ ان کے اعمال، خدا کے بنائے ہوئے اور مقرر کردہ راستے کے مطابق ہی رُو پذیر ہوتے ہیں مگر آدمی کو خیر و شر سے بخوبی آگاہ کر کے اسے آزادی عطا کر دی گئی ہے تاکہ وہ چاہے تو راہ خیر چن لے، اور چاہے تو راہ شر منتخب کر لے، قرآن کریم میں جس "الامانت" کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہی امانتِ مختاری و مسئولیّت ہے، وہ آیۂ امانت یہ ہے۔

"اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَانُ طاِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا ہ ــــــــ

"ہم نے الامانت زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں کو پیش کی مگر انہوں نے اس کے متحمل ہونے کی حامی نہ بھری، وہ اس سے ڈر گئے، مگر آدمی نے اس بار کو اٹھا لیا، یقیناً آدمی ظالم بھی تھا اور جاہل بھی" ــــــــ

حضرت شاہ ولی اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں رقم طراز ہیں اور فرماتے ہیں۔

"امانت سے مراد مکلّف ہونے کی ذمہ داری ہے مراد ہے اختیار و ارادہ کی متولیّت اس طرح کہ اطاعت اور نافرمانیِ احکام سے ثواب یا عذاب کا استحقاق ہو سکے ۔ اور آسمانوں اور زمین پر ان کے پیش کرنے کے معنی ہیں کہ ان کی استعداد ہی کا اندازہ کیا گیا کہ ایسے کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کا مادّہ ان میں ہے یا نہیں ہے اور ان کے انکار کرنے سے غرض یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں اس کام کی لیاقت اور استعداد نہ تھی اور یہ جو فرمایا کہ آدمی نے اس امانت کو برداشت کر لیا اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں ان امور کی انجام دہی کی ذاتی صلاحیّت تھی، میں کہتا ہوں کہ اس معنیٰ کے لحاظ سے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا گویا حکم سابق کی علّت ہے اس لیئے کہ ظالم اسی کو کہتے ہیں جس میں انصاف و عدل کی قابلیّت ہو لیکن پھر بھی انصاف نہ کرے اور جہول اس کو کہتے ہیں کہ باوجودِ قابلیّت) ناواقف رہے ۔ علاوہ آدم کے بعض چیزیں عالم اور عادل ہیں کہ ظلم اور جہل کا ان تک گزر نہیں جیسے کہ فرشتے اور بعض چیزیں ایسی ہیں کہ نہ وہ عالم ہیں اور نہ عادل ہیں اور نہ ان میں علم و عدل کا مادّہ ہے جیسے چہارپائے ــــــــ مکلّف ہونے کے قابل وہی چیز ہو سکتی ہے جس کا کمال بالقوّہ ہو نہ کہ بالفصل" ــــــــ

مکلّف ہونے کا معنیٰ مسئول اور جواب دہ اور ذمہ دار ہونا، بالقوّہ کا معنی ہے کسی شے میں کسی جوہر کا موجود ہونا جو آگے چل کے پروان چڑھ سکے اور بروئے کار آسکے ۔ گویا آدمی میں یہ اہلیّت موجود ہے کہ اپنی ذات میں ودیعت کردہ آدمیّت کو پروان چڑھا سکے ــــــ باقی جملہ مخلوقات اس جوہر سے محروم ہیں، ان کی صفات خود بخود جلوہ گر ہو جاتی ہیں، مثلاً فرشتے، حیوانات اور سماوی، آبی و برّی اور دیگر مخلوقات، اس کے مقابل آدم کو ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں اپنا جوہر پروان چڑھانا پڑتا ہے ــــــ اور بالکل ممکن ہے کہ وہ شریعت، اخلاق، آداب اور قواعد و ضوابط ہر شے کو پس پشت ڈالے اور اپنے جوہر آدمیّت کا گلا گھونٹ دے پھر جس قدر غلط کار ظالم اور انصاف کش آدم ہو سکتا ہے کوئی دوسری مخلوق

نہیں ہو سکتی۔ اس لیئے کہ کوئی دوسری مخلوق ایسی عزم و اختیار والی نہیں کہ اپنی فطری اور حیتی حدود سے تجاوز کر سکے، بلی بلی ہی ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کی حدود متعین کیا ہیں، اونٹ اونٹ ہی ہے اور ہمیں معلوم ہے اس کی حدود کیا ہیں۔ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا، لیکن فردِ آدم کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کب کس خواہش، مرضی یا ہوس کے تحت کیا کر گزرے، یہ شیر بھی ہو سکتا ہے اور گیدڑ بھی، یہ بلی بھی ہو سکتا ہے اور اونٹ بھی، جن بھی ہو سکتا ہے فرشتہ بھی، یہ ولی اللہ بھی ہو سکتا ہے اور ابلیس بھی، بلکہ ابلیس سے بڑھ کر بھی، مولانا حالی نے فرمایا تھا۔

ع
آدمی ؛ جانور فرشتہ خدا
آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں

آدمی میں جہاں خاکبازی کی اہلیت ہے وہاں اس میں الوہی رنگ میں بھی رنگے جانے کی قابلیت موجود ہے : تبھی تو ارشاد خداوندی ہے۔

"فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ"

اللہ نے فطرتِ الہی کے مطابق ہی تو انسانوں کو پیدا کیا، (تاہم) کسی مخلوق میں خلقی اور بنیادی تبدیلی عمل میں نہیں آسکتی"

گویا آدم کو جو قابلیت اہلیت اور امکانات از روئے خلق عطا فرمائے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ آدمی آدمی ہے تمام کمالات ممکنہ سمیت، لیکن اگر وہ اپنی اہلیتوں سے کام لینے میں غفلت برتے تو ؟ ______________

یہ ذمہ داری اس کی اپنی ہے اور اسی کے بارے میں اس سے پرسش بھی ہو گی۔ اور اسی سبب سے وہ مستوجب جزا و سزا بھی ہو گا وہ اپنی فطرت کو صحیح انداز میں پروان نہ چڑھائے تو مستوجب سزا و عقوبت ہو گا، بصورت دیگر مستحق انعام و عطا۔

وحی اسی لیئے نازل ہوئی کہ اولاد آدم کو اس کے فطری جوہر کی پرورش کے

ضمن میں مدد حاصل ہو سکے، اور عیاں ہے کہ آدم کی فطرت کا خالق ہی کاملاً آگاہ ہے کہ فطرتِ آدم کیا ہے اور اس کی تربیت کن خطوطِ آداب و اخلاق پہ ممکن ہے۔
اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ؟ (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟) ـــــــــ
چنانچہ خدائے خلّاق نے مرحلہ بہ مرحلہ ہر معاشرے میں اپنے ہادی بھیجے۔
وَلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ" (اور ہر قوم کے لیئے کوئی نہ کوئی ہادی بھیجا گیا) ـــــــــ
ہر ہادی اللہ کی ہدایت برآئے آدم کا عملی نمونہ تھا، لہٰذا وہ اس معاشرے کا بہترین انسان تھا، لفظی وحی اس پیغمبر کے وسیلے سے آنے والی ہدایت کا تسلسل تھی جسے اُس پیغمبر کی سیرت کے مطابق نافذ رہتا تھا ـــــ اگرچہ پیغمبرانِ خدا اپنے اپنے معاشرے کے بہترین انسان تھے جبھی تو ان پر وحی نازل ہوئی۔ تاہم کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس وحی کو قبول کر لینے والے افراد ہمیشہ اقلیّت میں رہے اور اس وحی کو رد کر دینے والے ہمیشہ اکثریت میں رہے، سبب ظاہر ہے کہ آدم کو حق انکار بھی اور حق اقرار بھی حاصل ہے۔ اور عموماً ہر فرد بشر جبلّی حیوانی سطح سے اوپر اُٹھنے میں دقّت اور مشقّت محسوس کرتا ہے، جس طرح جسمانی قوت کے لیئے موافق غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور ساتھ مشقت طلب ورزش و محنت کی بھی، اسی طرح روحانی قوت کے لیئے بھی مناسب غذا اور مناسب ورزش کی ضرورت ہے، آدمی جسمانی غذا اور جسمانی قوّت کا نسبتاً بہت زیادہ خیال رکھتا ہے، روحانی پہلو کو نظرانداز کر دیتا ہے نتیجہ یہ کہ "جوہر آدمیّت" دب جاتا ہے۔ اس میں اصلاً تبدیلی تو واقع نہیں ہوتی ہاں اس کی عمل پیرائی مسدود ہو جاتی ہے۔

روحانی پہلو کی تربیت نہ ہو سکنے کے سبب سے وجودِ آدم کے عمومی رویئے حیوانی ہی رہتے ہیں۔ اگر خدائی اصول و ضوابط یعنی شریعت کی پاسداری پوری پائداری کے ساتھ عمل میں نہ آئے تو آدمی واقعی آدمی نہیں بن سکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی پڑھا لکھا کیوں نہ ہو ـــــــ پڑھا لکھا ہونا اور بات ہے

لیکن آدمی ہونا اور بات ہے، سورہ جمعہ میں آتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۔۔۔۔۔

"ان لوگوں کی مثال جن کو تورات کا حامل بنایا گیا مگر انھوں نے اس ذمہ داری کا حق ادا نہ کیا اس گدھے کی سی ہے جس نے بڑی بڑی اور مقدس کتب کا بوجھ اٹھا رکھا ہو" ۔۔۔۔۔

یہ آیۂ کریمہ قوم یہود کی طرف اشارہ کر رہی ہے، لیکن معنیٰ تو عام ہے یعنی جو فرد یا افراد وحی کے حامل ہوں، ہدایت ان تک پہنچ چکی ہو اور اس کے باوجود عملاً اس ہدایت پر کاربند نہ ہوں تو ان میں اور کتب مقدسہ کا بارِ گراں اٹھانے والے گدھے کے مابین کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟ ۔۔۔۔۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی حق یہ ہے کہ حیوانی سطح پر رہنے والے مادّہ پرست اور بدنی لذتوں کا شکار لوگ ایسے بدمست اور مغرور ہو جاتے رہے ہیں کہ اپنے پیغمبروں کی توہین کے مرتکب ہوئے جیسے قوم لوط نے حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کہا "نکالو ان کو اپنے قصبے سے یہ بڑے پاک باز بنے پھرتے ہیں" قرآن گواہ ہے کہ قوموں نے ہدایت خداوندی قبول کر لینے کے بجائے بارہا اپنے پیغمبروں کو قتل کر کے رکھ دیا، یوں اگر بہ نظر غائر دیکھیں تو محسوس ہو گا کہ آدم کی اولاد نے اپنی مرضی اور اختیار کا استعمال سرکشی کی حد تک کیا اور یہی اکثریت کا طریق رہا۔ اس لیئے کہ اکثریت تربیتِ اخلاق سے محروم رہی۔ خواہ علم دین و دنیا اور معلوماتِ دینی و دنیوی کتنی بڑھ گئی ہوں۔ ضروری نہیں کہ ہر عالم آدمی خواہ دینی علوم کا ماہر ہو یا دنیوی علوم کا دوسرے آدمیوں کے مقابل انسانیت کے اعتبار سے بہتر ہو، ایک عالم شخص ہو سکتا ہے حریص ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک ان پڑھ آدمی سخی اور غریب پرور ہو۔ بالکل ممکن ہے ایک حافظ قرآن جھوٹ بولتا ہو اور اس کے مقابل ایک ادنیٰ طالب علم جھوٹ کے سائے سے بھی بھاگتا ہو،

بالکل ممکن ہے کہ اجتماعی علوم کا ماہر ایک پروفیسر ایک بُرا ہمسایہ ہو اور ایک بے علم شخص اپنے ہمسایوں کے سُکھ کا باعث ہو، عموماً انسانی معاشروں کے افراد حیوانی سطح سے اوپر نہیں جاتے، ہمیں یاد ہے کوئی پندرہ برس قبل نیویارک میں رات کے وقت چند گھنٹوں کے لیئے بجلی کا نظام خراب ہوگیا تھا نتیجہ کیا نکلا؟ دوکانیں لٹ گئیں۔ درجنوں قتل عمل میں آئے۔ ہزاروں عورتوں کی عصمت دری ہوئی، اور یہ سب کچھ علمی و سائنسی اعتبار سے ایک نہائیت ترقی یافتہ ملک کے سب سے مشہور اور اہم شہر میں ہوا ——— ان دو پائے حیوانوں کی حیوانیت کا علم تہذیب اور آدابِ معاشرت سے آگاہی نے ان کا کیا بگاڑ لیا؟ ———

یہ حضرت عیسیٰؑ کی انجیلی امت کا حال ہے، ہمارا حال کہ ہم قرآنی امت ہیں کم قابلِ رحم نہیں ہے، کوئی بیس پچیس برس قبل ہمارے ملتان منٹگمری (حال ساہیوال) ریلوے لائن پر ایک خوفناک حادثہ مسافر ریل گاڑی کو پیش آیا، آدھی رات کا وقت تھا، ارد گرد کے گاؤں والے ٹوٹ پڑے، زخمیوں اور مردوں کی دیکھ بھال کے بجائے مال لوٹنا شروع کر دیا، گٹھڑیاں سوٹ کیس، بٹوے گھڑیاں، عورتوں کے زیورات حتیٰ کہ جلدی کے باعث بالیوں کی خاطر زندہ اور مردہ اور نیم مردہ عورتوں کے کان کاٹ ڈالے ——— انسانی ہمدردی کا تقاضہ تو ہر دل میں ہوتا ہے مگر جب بھی اس نے وحشت کا موقع پایا۔ سارا انسانی ہمدردی کا تقاضا ہوگیا۔

پھر جس طرح حیوانوں کو بند کر کے یا خوف زدہ کر کے ان کے شر کا مداوا یا تدارک کیا جاتا ہے اسی طرح انسانی وحشت کو بھی ڈر اور خوف کی شدید ضرورت ہے۔ وہی ضابطے اور آئین مفید ثابت ہو سکتے ہیں جن میں سنگین سزا خود سزا کے نفاذ سے بڑھ کر خوف زا تر ہو، ایک قاتل کی سزا اگر قتل ہے تو اس میں ایک آدمی کی قصاصی موت سے بڑھ کر دوسروں کو متنبہ کرنے کا پہلو موجود ہوتا ہے اور پھر یہ بھی کہ جس آدمی نے ایک قتل کیا ہے وہ اگر زندہ و سلامت رہے

تو اس سے کسی ایسے ہی اور قتل کی بھی توقع ہو سکتی ہے، کم از کم قاتل دوبارہ تو قتل نہ کرے۔

ابھی اگلے روز میں ایک انگریزی رسالہ پڑھ رہا تھا، کویت میں سالہا سال رہنے کے بعد ایک محترمہ واپس انگلینڈ گئی، اس نے وہاں سے اپنی بیٹی کو جو کویت ہی میں ہے۔ خط لکھا کہ خدا کی پناہ، نہ دن محفوظ ہے نہ رات، قتل اور ڈاکے عام، چوروں کا ہر دم کھٹکا، میں تو گھبرا گئی ہوں، کویت میں تو رات کے کسی بھی حصے میں اکیلی گھر سے ہسپتال آتی جاتی تھی اور میں کتنی محفوظ تھی، رات کو گھر کے باہر والے دروازے کا بند کرنا بھی ضروری نہ جانتی تھی پھر بھی خطرے سے بے فکر تھی ——————

اس عبارت کا معنیٰ واضح ہے کویت میں قانون سخت ہیں اور ان کا نفاذ بڑا خوف پرور ہے، اگر ایک فرد کی شدید اور بے لحاظ سزا کے باعث لاکھوں افراد سکھ کی نیند سوئیں تو اس میں کیا حرج ہے، اگر ایک ہاتھ کے کٹ جانے کے خوف سے لاکھوں ہاتھ ایک دوسرے کے شر سے مامون ہو جائیں تو اس میں خرابی کیا ہے ؟

بہرحال اصل بات وہیں کھڑی ہے کہ بے شمار پیغمبرؑ آئے، وحیٔ ہدایت لائے، خود ان کی اپنی سیرت بہترین مثال تھی، پیغمبروں کے بے شمار پیروؤں نے بھی قربانیاں دیں لیکن عالم انسانیت کا غالب حصّہ انسان نہ بن سکا۔ مسلم ہمیشہ کم تر رہے اور سرکش اور باغی ہمیشہ زیادہ رہے، خود قرآن کے نزدیک ایسے سرکش حیوانوں کے ایسے قرار دیئے گئے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے۔

"اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ "

خداوند کریم سورۃ الفرقان کی آیت نمبر چوالیس میں فرماتے ہیں۔

" اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؟

کیا تم اس گمان میں ہو کہ ان کی اکثریت سنتی یا سمجھتی سوچتی ہے ؟

پھر ارشاد فرمایا:۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (سورۂ لقمان آیت پچیس)

"لیکن اس کا کیا علاج کہ اولادِ آدم کی اکثریت یہ بات نہیں جانتی"۔

سورہ الشعراء (چھبیس) كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ "قوم نوحؑ نے رسولوں کو جھٹلایا"۔ مراد ہے فقط حضرت نوحؑ ہی کو نہیں ان سے قبل اور شاید بعد بھی وہ لوگ یہی کچھ کرتے، اسی طرح اسی سورۃ میں آتا ہے كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ، كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ، كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ كَذَّبَ اَصْحَابُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ———— یہ سب قومیں اور معاشرے اور گروہ پیغمبروں کو جھٹلاتے رہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے جب آپؐ کو جھٹلانا شروع کیا اور سرکشی و نافرمانی کا رویہ اختیار کیا تو خداوند کریم نے فرمایا۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ

اے رسولؐ اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا رہے ہیں (تو جان لیجئے) کہ آپ سے قبل بھی رسولوں کو جھٹلایا جاتا رہا ہے۔

دنیا میں کسی مخلوق کو خدا نے یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ حکم خداوندی کو چاہیں تو قبول کریں اور چاہیں تو قبول نہ کریں، اولادِ آدم کی اکثریت نے خداوندِ کریم کے اس اعتماد کا جواب مثبت میں دینے کے بجائے منفی میں دیا، فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا، یعنی اکثر لوگوں نے وطیرہ اگر اختیار کیا تو ناشکر گزاری کفران اور عدوان کا۔

یہ مضمون تو کئی مجلّدات کا طالب ہے، مگر میں یہیں پر بس کرتا ہوں، میں نے خالقِ کون و مکاں کی (جو اولاد آدم کا بھی خالق ہے) آخری کتاب ہدایت تک عموماً بات محدود رکھی ہے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؟

کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ؟ — وہی سب سے بہتر جانتا ہے، اسی نے پیدا کیا، اسی نے ہدایت دی، اور اسی نے یہ بھی فرمایا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ ۔

ناس ہو انسان کا یہ کیسا ناشکر گزار ہے ۔

باقی رہا یہ کہ علوم انسانی یا انسانیات کے ماہرین یا اہلِ فلسفہ و نفسیات ، یا دانایانِ علم الاجتماع اور اہل تصوّف کیا فرماتے ہیں تو یہ بات بہت لمبی ہے، بہت ہی لمبی، اور پھر آدمی کا علم آدمی کے بارے میں وہ ہو بھی تو نہیں سکتا جو خود خلّاق الانسان کا ہے ۔ اور آخری کتاب ہدایت یعنی قرآن کریم صرف بیانِ شانِ خداوندی ہی نہیں، وہ ترجمانِ انسان بھی ہے ،

پروفیسر محمّد منور مرزا

سابق ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی پاکستان

مورخہ ۸۹-۹-۲

محترم میرزا ادیب صاحب

جناب عالی: آپ ہمارے ان بزرگ دانشوروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے داستان گوئی افسانہ نویسی اور ڈرامہ نگاری کے ذریعے انسانی نفسیات اور انسانی معاشرے کا فنکارانہ مطالعہ نہائیت انفرادی آن بان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آپ نے خود بھی سچائی کی تلاش میں اور جھوٹ کی مذمت میں اپنا شخصی کردار نہائیت ولاورانہ انداز میں ادا کیا ہے۔ جس کی شہادت آپ کی معروف خود نوشتہ سوانح حیات پیش کرتی ہے آپ نے اپنی طویل ادارتی زندگی میں فن کے میدان میں حق و سچ کے علمبرداروں کی کئی نسلوں کی تربیت اور راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اس لیئے میں بجا طور پر توقع کرتا ہوں کہ آپ میرے سوال کا جواب دے کر میرے اس یقین کو پختہ تر کر دیں گے کہ آپ اپنے تجربے کی وسعت، اپنے تدبر کی گہرائی اور اپنی سیرت کی رفعت کی بدولت اس سوال کا تسلی بخش جواب مہیا کرنے کے لیئے موزوں ترین فنکاروں میں سے ایک ہیں۔

غیاث چودھری

آپ کا سوال نہائیت اہم ہے۔ اس لحاظ سے نہیں کہ موجودہ دور میں اس کی اہمیت واضح ہوئی ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں جب سے انسان نے اس دنیا میں رہائش اختیار کی ہے اور زندگی بسر کرنے کا تعین کیا ہے یہ سوال اس کے سامنے رہا ہے۔ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس سوال سے وہ کبھی نجات نہیں پا سکا۔ اور اب تک جتنی بھی تگ و دو انسانیت کی دنیا میں ہوئی ہے وہ اسی سوال کا جواب دینے میں ہوئی ہے یعنی سچائی کیا ہے اور اس کو کس طرح تلاش کیا جا سکتا ہے، اس کو کس طرح انسانی زندگی کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیئے کیا قربانیاں دی جا سکتی

ہیں اور اس کا اجتماعی تصور کیا ہے ۔ بعض اوقات یہ کہا جاسکتا ہے کہ سچائی کا انفرادی تصور جو ہے تو اجتماعی تصور نہیں ہوتا ۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے سچائی اب تک ایک ہی رہی ہے اور وہ سچائی یہ ہے کہ انسان کی جدوجہد اس طریق سے کی جائے کہ جو چیز بھی انسانی ترقی میں حائل ہو اس کو الگ کر دیا جائے ۔ مثلاً میں یوں کہتا ہوں کہ ہر دور میں اس طرح ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی بسر کرنے کے کچھ اصول متعین کئے ہیں جیسے ہمسائیوں کے ساتھ اچھا سلوک ، زیر دستوں کے ساتھ نیک سلوک ، دو انسان اگر مل کر کام کریں تو ایک دوسرے سے حُسنِ سلوک سے پیش آئیں ۔ یہ سب اقدار آج بھی موجود ہیں اور اس زمانے میں بھی انسان کا یہی نظام اقدار تھا تو انسان اس نتیجے پر پہنچا کہ انسانی زندگی میں جو بھی رکاوٹ آتی ہے وہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر، انسانی زندگی کو نقصان پہنچاتی ہے، انسان کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے ۔ اگر مذہبی اصطلاح استعمال کریں تو اسے ہم نیکی کہیں گے یا ایک ایسا کام جس سے ثواب حاصل ہوتا ہے ۔ مذہبی اصطلاح ، سماجی اصطلاح اور کوئی بھی اصطلاح کہیں، سچائی کا تصور وہی بنتا ہے جو انسان کے اندر لاکھوں سال پہلے پیدا ہوا تھا شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، جس زمانے میں انسان ہاتھ میں تیر کمان لے کر جنگلی جانور شکار کر کے خوراک بہم پہنچاتا تھا تو اس وقت کچھ ذمہ داری محسوس کرتا تھا کیونکہ اس کے بچے جو کہ غاروں میں اس کے ساتھ رہتے تھے تو اس طرح وہ محسوس کرتا تھا کہ میں جو شکار کر رہا ہوں اس پر میرے بچوں کا بھی حق ہے یہ میری ذمہ داری ہے کہ ان کو خوراک مہیا کروں ۔ پھر وہ غالباً اپنی تنہائی کے لمحوں میں یہ بھی محسوس کرتا ہوگا کہ وہ جو میرا ہمسایہ ہے وہ بیمار ہے اور شکار کو نہیں جا سکتا ۔ تو میرا فرض ہے کہ میں اپنے بال بچوں کے حصے میں سے اس کے بال بچوں کو بھی حصہ دوں ۔ یوں نیکی کا تصور یا یوں کہہ لیجئے کہ سچائی کا تصور انسان کے اندر پیدا ہوا اور یہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا ۔ ترقی کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان نے سوچ بچار کی اور ہر دور میں سوچ بچار کی اور ہر دور میں سچائی کا ایک تعین کیا ، یعنی سچائی

کے تصور کا تعین کیا۔ میرے نزدیک سچائی وہی ہے جس سے انسانی زندگی آگے بڑھے اور جو چیز اس کی راہ میں حائل ہو اسے الگ کر دیا جائے۔ آج کا دور تو یہ ہے کہ جس میں نظام حیات ایک قسم کا متعین ہو چکا ہے اور ہم کہتے ہیں زیر دستوں پہ ظلم نہیں کرنا چاہیئے، استحصالی قوتوں کے خلاف لڑنا چاہیئے۔ یہ اس لیئے کہ استحصالی قوتیں سچائی کو ختم کر دیتی ہیں، وہ دوسروں کا حق چھین لیتی ہیں اور جو دوسرے کا حق ہے وہ ایک قسم کی سچائی ہے تو سچائی کو آپ جتنی وسعت دیتے جائیں گے۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہ وہ چیز ہے جس کو ہم اپنی اصطلاح میں سچائی کی تلاش کرنا کہتے ہیں، اور آپ یہ بھی محسوس کریں گے کہ جب ہم مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمارے اندر جو ایک انسانیت کا جوہر ہے یا جسے ہم انسانی قدر و قیمت کہتے ہیں یا جو یہ انسانی اقدار ہیں یا جو نیکی کا تصور ہے اسے آگے بڑھانا چاہیئے۔ بعض اوقات کچھ ایسے کردار آتے ہیں جنہیں ہم واقعات کے ساتھ مربوط کرتے ہیں اور آخر میں ایک نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ وہ کردار نیکی کے راستے پر آکر اپنے گمراہ کن کردار سے تائب ہو جاتا ہے تو یہ بھی ایک طرح سے نیکی کا تعاقب ہے، بلکہ ہر شخص جب دنیا میں آتا ہے تو وہ نیکی کا تعاقب شروع کر دیتا ہے مذہب بھی اس کے راستے میں آکر اس کی مدد کرتا ہے۔ سماجی حقیقتیں اس کی مدد کرتی ہیں سماجی عزم اس کے ہمراہ ہوتا ہے پھر اس کا اپنا ذہن اس کا شعور اس کی مدد کرتا ہے یہ سب چیزیں مل ملا کر اس کو اس قابل بنا دیتی ہیں کہ وہ سچائی کی تلاش کرے اور سچائی جسے اگر میں مذہبی اصطلاح میں عرض کروں تو وہ نیکی کہلاتی ہے!

یہاں میں آپ سے اختلاف کروں گا کہ ہر شخص سچائی کا علمبردار کیوں نہیں ہے جب کہ وہ سچائی کا دعویدار رہے وہ کہتا ہے کہ میں سچائی کی تلاش کر رہا ہوں کیونکہ سچائی میرا نصب العین ہے، سچائی میرا مطمح نظر ہے، سچائی میرا مشن ہے میں سچائی کے راستے پہ چلنا چاہتا ہوں جسے میں سمجھتا ہوں کہ یہ منافقت ہے سچائی جو ہے تو وہ سچائی ہے اور جھوٹ جو ہے تو وہ جھوٹ ہے انسان لاکھ کہے کہ میں

سچائی کی تلاش کر رہا ہوں لیکن جب تک اس کے اندر، اس کی خواہشات اس کے میلانات، اس کے اپنے خواب جن کی بنا پر وہ چاہتا ہے کہ وہ ایک رات میں دولت مند بن جائے، تو یہ نیکی نہیں، یہ سچائی نہیں ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ انسان رزق حاصل کرے لیکن اپنی جد و جہد کے ساتھ، اپنی محنت کے ساتھ، حق حلال کی کمائی حاصل کرے یہ ہمیشہ سے رہا ہے کہ اگر سچائی کی علمبرداری ہوتی تو اس سے جد و جہد کا مقصد کیا تھا جیسے اندھیرا ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ روشنی آنے والی ہے اور جب دن طلوع ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ روشنی آگئی ہے، لیکن جب اندھیرا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ روشنی ضرور آئے گی یعنی روشنی کے لیئے ہم منتظر رہتے ہیں۔ یہی مثال زندگی میں سچائی کی بھی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص خود کو سچا سمجھتا ہو وہ سچا بھی ہو کیونکہ سچائی کا جو تصور ہے وہ ایک اجتماعی تصور ہے جیسے کہ روشنی ہے سب سمجھتے ہیں کہ یہ روشنی ہے لیکن بعض لوگ روشنی کے دشمن ہیں وہ روشنی نہیں چاہتے۔ مثلاً ایک چور ہے وہ چوری کرنا چاہتا ہے اندھیرے سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اس کے کچھ مذموم عزائم ہیں وہ یہ چاہتا ہے کہ اندھیرا ہو گویا وہ روشنی نہیں چاہتا۔ اسی طرح روشنی کو چاہنے والے لوگ جو ہیں تو وہ اس کے لیے آرزو مند رہتے ہیں۔ لیکن جو اندھیرے میں اپنے مذموم مقاصد پورا کرنا چاہتے ہیں وہ اندھیرے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اندھیرے کو بہتر سمجھنے والے لاکھ کہیں کہ ہم روشنی کے جویا ہیں ہم روشنی کی تلاش کرتے ہیں دراصل وہ نہیں کرتے، اس لیئے میں نے جو یہ کہا ہے کہ انسان نے ہمیشہ سچائی کی جد و جہد کی ہے اور اگر جد و جہد کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر دور میں ہر عہد میں سچائی خطرے میں مقید رہی ہے اگر سچائی اس طرح آتی جس طرح صبح طلوع ہو جاتی ہے تو اندھیرا خود بخود فتح ہو جاتا۔ تو پھر جد و جہد کی ضرورت نہیں تھی۔ جد و جہد ہی اسی بنا پر کی گئی ہے پہلے بھی کی گئی تھی اور آئندہ بھی کی جاتی رہے گی۔ سو جو لوگ سچائی کو سمجھتے ہیں وہ اس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں وہ سمجھتے

ہیں کہ اگر سچائی زندہ ہے تو وہ بھی زندہ ہیں، اگر سچائی ختم ہو جاتی ہے تو وہ بھی مر جاتے ہیں سچائی کو زندہ رکھنے کے لیئے، سچائی کی شمع کو زندہ رکھنے کی خاطر یہ سب قربانیاں دی جاتی ہیں تو اس لیئے میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم سچائی کے علمبردار ہیں وہ سچائی کے علمبردار نہیں ہو سکتے۔

میرزا ادیب

محترم سید نیّر علی دادا صاحب

جنابِ عالی، آپ فنونِ لطیفہ کے حوالے سے ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ جس کی قدر آوری کا اعتراف تمام اطراف سے بجا طور پر نہائیت کشادہ دلی کے ساتھ کیا گیا ہے آپ ایک پُر مایہ ماہرِ تعمیرات بھی ہیں، ایک بلند پایہ اور منفرد مصور بھی ہیں، آثارِ قدیمہ کے ایک بالغ نظر محافظ اور آرائش کنندہ بھی ہیں۔ آپ کی مختلف النوع خداداد صلاحیتوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ آپ نے روائت اور جدیدیت کا ایک درخشاں سنگم استوار کیا ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے فنونِ لطیفہ کے نشوو ارتقار کو تاریخ و تہذیب کے تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش کی کامیابی کا بین ثبوت یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے بیشتر دانشوروں نے آپ کی اس قدرِ مشترک کو بر ملا اور بیک زبان خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم عصر فنکاروں نے آپ کے اس منفرد اسلوب کو اپنا کر آپ کو عملاً بے پایاں ستائش کا اعزاز بھی بخشا ہے۔ فن آرٹ کے قدرشناسوں نے آپ کو مختلف فنی تنظیموں اور کونسلوں کے نہائیت اہم منصب سونپ کر آپ کی بے پناہ صلاحیتوں کی پذیرائی بھی کی ہے۔ اس لیئے میں بجا طور پہ توقع کرتا ہوں کہ آپ میرے دقیق و نازک سوال کا بڑے انفرادی انداز میں تسلی بخش جواب فراہم کر کے بہت سے لوگوں کو نئے زاویئے سے متعلقہ مسئلے پر غور کرنے کی سعادت بخشیں گے اور مجھے اس کے لیئے ممنون ہونے کا موقع عطا فرمائیں گے۔ غیاث چودھری

غیاث چودھری صاحب آپنے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ یوں ہے کہ برش کی عملداری چھوٹ کے مقابلے میں کم ہے بلکہ بہت کم ہے۔ حالانکہ سبھی برش کی حمائیت کرتے ہیں یہ موضوع میرے لیئے اس حوالے سے حیرت کی بات ہے۔

کہ انسان نے اب تک بہت ترقی کی ہے ـــــ سائنسی میدان میں، فلسفیانہ لحاظ سے اور انسانی شعور کے طور پر یایوں کہیئے کہ انسانی زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں ان میں خاطر خواہ افزائش ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود آپ کا دعوہ افسوسناک حد تک درست ثابت ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی رویئے میں کوئی بنیادی ہی تبدیلی نہیں آئی۔ جیسے گذشتہ زمانوں میں یہ ہوتا تھا کہ lust ـــ power 'hungery ـــ hungery نظریئے کے تحت لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اور ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیئے لوٹ مار اور قتل وغارت ہوا کرتی تھی لیکن موجودہ زمانے میں صورت حال بدل گئی ہے، یونائیٹڈ نیشنل کے قیام سے، جنیوا کنونشن کے وجود میں آنے سے انسانی رویئے تو sophisticated ضرور ہو گئے ہیں مگر نفسا نفسی کا عالم بالکل ویسا ہی ہے۔ جیسا پچھلے ادوار میں تھا۔ طاقتور ممالک اپنے مفاد کے تحت یونائیٹڈ نیشنل کو بھی استعمال کرتے ہیں کسی زیادتی کے مرتکب ملک کے خلاف سلامتی کونسل میں رائے زنی ہوتی ہے اور اس ملک کو بُرا بھلا کہا جاتا ہے تو یہ عمل اگر امریکہ یا روس کے خلاف ہو تو وہ اس کو ویٹو کر کے ختم کر دیتے ہیں۔ تمام ملکوں کے نمائندوں کی موجودگی میں سچ کی نفی کی جاتی ہے اور پھر ایک المیہ یہ ہے کہ ایسے فورم میں بیٹھ کر جو ساری دنیا میں سچ کی بالیدگی کے لیئے بنایا گیا ہے۔ سب کی موجودگی میں علی الاعلان جھوٹ کو مسلط کیا جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم سچ کو دنیا میں وارد نہیں کر سکے۔ اب ایسی صورت حال میں ایک کمرشل ادارے کی بات کیا کریں۔ جب کہ بین الاقوامی سطح پر جو بڑے بڑے ادارے بنائے گئے ہیں جیسے سکورٹی کونسل، جنیوا کنونشن اور یونائیٹڈ نیشنل وغیرہ میں اجتماعی کاوشوں کے باوجود انسانی فلاح و بہبود کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے۔

آج دنیا والے جس چیز کا شکار ہیں وہ ہے کاروباری پن، وہ ہے طاقت کا کھیل، وہ ہے سرمایہ داری کا کھیل، دوسرے لفظوں میں روپے کا کھیل، لہٰذا روپیہ حاصل کرنے کے لیئے ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بائیڈروجن بم اور نیوکلیائی ہتھیار

بنانے کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ طاقتور ہو کر بھاری فیکٹریاں لگائیں اور پھر کمزور قوموں میں وہاں سے اسلحہ خریدنے پر مجبور ہوں۔ کیونکہ آج کوئی دوسروں سے زمین تو خریدتا نہیں یا حملہ کر کے دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ بڑی طاقتیں دوسروں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا چاہتی ہیں تاکہ وہ اُن پر اقتصادی طور پر حاوی ہو جائیں اور اپنی مصنوعات اپنی مقرر کردہ قیمتوں پر ان کے پاس فروخت کریں تو دوسرے لفظوں میں طرزِ جنگ بالکل بدل چکا ہے جب کہ بنیادی طور پر فلسفۂ جنگ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی کیونکہ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں آج بھی موجود ہیں لیکن انہوں نے اپنے طریق واردات بدل لیئے ہیں یعنی بھیڑیوں نے بھیڑوں کی کھالیں پہن رکھی ہیں۔ اب وہ ہاتھ میں تلوار لے کر یہ نہیں کہتے کہ ہم مار دیں گے بلکہ مکر و فریب سے کام لیتے ہیں اس طرح مکر و فریب میں بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ لہٰذا پسح کی بالیدگی کا فی الحال اس معاشرے میں کوئی امکان نظر نہیں آتا کیونکہ موجودہ معاشرے کی اقدار سرمایہ داری اور طاقت پر استوار ہیں اور اس طاقت کو حاصل کرنے کے لیئے بے رحمانہ کاوشیں جاری ہیں اور ان بے رحمانہ کاوشوں کو تحفظ دینے کے لیئے جو طریقہ ہائے کار وضع کیئے ہیں اُن کو بڑا sophisticated انداز میں منظرِ عام پر لایا جاتا ہے جس سے پسح ہی کا بول بالا نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر انسانی حقوق کا ذکر بھی ہوتا ہے انسانوں کی برابری کا ذکر بھی ہوتا ہے، گورا کالا ایک برابر کی تکرار بھی سنائی دیتی ہے جب کہ اصل صورت حال یہ ہے کہ کالوں کو تو نوکری ہی نہیں ملتی۔ بلکہ نوکری کی جگہ انہیں مار پڑتی ہے گویا کہنے کی باتیں اور ہیں اور کرنے کی باتیں اور ہیں۔ اس صورت حال میں ابھی تک یہ بات درست نظر آتی ہے کہ آج بھی چنگیز خاں اور ہلاکو خاں اپنی پوری ظالمانہ کاروائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ صرف ان کے طور طریقے وقت کی مناسبت سے بدل گئے ہیں۔ اب وہ یہ اعلان کر کے نہیں آتے کہ ہم آرہے ہیں اور تمہیں لوٹ کر لے جائیں گے بلکہ اب وہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ہم آپ کی مدد کرنے آرہے ہیں آپ کی مشکلیں دور کرنے آرہے ہیں ہم آپ کے لیئے

امداد لے کر آرہے ہیں جیسے ہندوستان سری لنکا میں فوجیں اتار کر کہتا ہے کہ ہم تو ان لوگوں کی مدد کرنے آئے ہیں حالانکہ جب کوئی مدد کے لیے آتا ہے تو اس کو خوش آمدید کہا جاتا ہے جب کہ سری لنکا کے لوگ انڈین فوجوں کے خلاف جلوس نکال رہے ہیں کہ خدا کے لیئے واپس جاؤ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔

اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ مکرو فریب کو جو عروج آج کل کے زمانہ میں حاصل ہوا ہے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا معاشرے میں منافقت اور مادہ پرستی بہت بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے نفسا نفسی کا عالم ہے۔ دوسری طرف لوگوں پر جو مذہب کا مثبت اثر تھا وہ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے گو کہ لوگوں پر مذہب کا منفی اثر بھی ہوتا تھا کیونکہ جب ان تک مذہب کی صحیح سپرٹ نہیں پہنچتی تھی تو لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے قتل وغارت بھی ہوتی تھی مگر اس کے باوجود مذہب کا مثبت اثر بھی لوگوں پر نسبتاً بہت زیادہ تھا اور مذہب ہی کی بنیاد پر لوگوں میں بڑے مضبوط کردار پائے جاتے تھے۔ اب بھی مذہب کے بنیادی ثبوت تو ہمیں جگہ جگہ نظر آتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں اس کا بھی کوئی مثبت انداز میں عملی نمونہ لوگوں کی روحوں تک نہیں پہنچا لہٰذا دکھ کی بات یہ ہے کہ اس کا اثر بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اب اگر موجودہ زمانے کے معیار پر پرکھا جائے کہ کون آدمی کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے تو کامیاب وہ آدمی گردانا جاتا ہے جس کے پاس دولت ہے روپیہ پیسہ ہے جب کہ دوسری طرف وہ آدمی کامیاب نہیں سمجھا جاتا جس کے پاس اچھا کردار ہے کوئی اچھا لکھا پڑھا انسان ہے۔ کم از کم تیسری دنیا کے ممالک میں تو مذکورہ لوگوں کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی پروفیسر ہے اور اس کی بیٹی کے رشتے کی بات ہو تو سمجھا جائے گا کہ اس کی تو آمدنی ہی محدود ہے اس لئے سوچ سمجھ کر ہی بات ہوگی، البتہ ترقی یافتہ ممالک میں علم و ادب کی قدر و قیمت اپنی جگہ پر ضرور ہے۔ لیکن اجتماعی طور پر جو دوڑ لگ رہی ہے وہ خطرناک حد تک انسانی مفاد کے خلاف جا رہی ہے تو ایسی صورت حال میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سچ کی عملداری ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ اگر سچ کو پنپنے کا موقع ملے۔ تو وہ آج کل کے انفرادی بھی اور اجتماعی بھی دونوں حوالوں سے لوگوں کے مفاد کے

خلاف جاتا نظر آئے گا۔ میرے خیال میں انسان کا ذہنی ارتقا مذہب کے حوالے سے اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے عمل میں آیا ہے وہ صحیح طور پر انسانی دل و دماغ میں نفوذ نہیں کر سکا۔ ورنہ آج ہم یقیناً سچ کا فروغ دیکھتے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مذہب میں بھی دھڑے بازیاں آگئی ہیں اور اس میں کاروباری پن در آیا ہے لوگوں کا رجحان مادہ پرستی کی طرف ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انسانی شعور نے جن اعلیٰ اوصاف و اقدار کو جنم دیا تھا وہ ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ دنیا کے تمام ممالک، جن میں امیر ملک بھی اور غریب ملک بھی شامل ہیں۔ سبھی روپے پیسے اور مادیات کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں اگر کمرشلزم کا طریق کار محدود ہوا اور وہ انسانی اقدار کو نقصان پہنچائے بغیر آگے بڑھے تو حرج کی کوئی بات نہیں لیکن اب یہ گھوڑا بے قابو ہو چکا ہے اور دنیا والوں کے دماغ اس گھوڑے پر سوار ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس دوڑ کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ایک لاکھ کے دو لاکھ اور دو لاکھ کے چار لاکھ کرتے ہیں۔ اس میں جھوٹ یا سچ کی بات نہیں ہوتی صرف فائدے کی بات ہوتی ہے اس ٹریڈ میں کہتے ہیں "سب چلتا ہے" اس طرح ظاہر ہے سچ دبتا چلا جاتا ہے اور جھوٹ کی عملداری بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کاروبار کو چلانے والے تجارتی ذہن کے مالک لوگ بڑے طاقتور ہو جاتے ہیں انہوں نے تمام اخلاقی تعلیمات کے شعبے تمام انصاف کے شعبے، حکومت کی پوری انتظامیہ حتیٰ کہ یونائیٹڈ نیشنز تک کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہوتا ہے۔ تمام ذرائع ابلاغ تک ان کی رسائی ہوتی ہے اور وہ انہی وسائل کے ذریعے انسانی ذہن کو کنٹرول کرتے ہیں اور اُسے جیسے چاہتے ہیں ویسے چلاتے ہیں۔

دنیا میں اچھے لوگ تو ضرور موجود ہیں لیکن اُن کی تعداد بہت کم ہے ان لوگوں میں فلسفی بھی ہیں اور وہ بھی ہیں جو روپے پیسے کے لالچ میں نہیں آتے۔ ان کی تعلیمات سے ہی دوسرے لوگ ذہنی روشنی حاصل کرتے ہیں اور وہ لوگ ایک کونے میں پڑے سے پڑے کائنات کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور دنیا والوں کو متنبہ

بھی کرتے رہتے ہیں کہ نظام کائنات میں انسان کے غلط کاموں کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں جیسے کچھ گیسیں ایسی پیدا ہو رہی ہیں جو انسانی زندگی کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں اور پوری دنیا کے ماحول میں آلودگی بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے وہ وقت آنے والا ہے کہ جاندار مخلوق کے لئے سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔ جنگلات پر اتنا بُرا اثر پڑے گا کہ درخت بہت کم رہ جائیں گے فضا کے اندر ایک اوزون کی تہہ ہوتی ہے وہاں پر ایک گرین ہاؤس efect پیدا ہو رہا ہے جس کی وجہ سے درجۂ حرارت تبدیل ہو جائے گا، دنیا والوں کے لئے بہت بڑی مصیبت آجائے گی۔ دانشور لوگ اسی بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ جو بہت بڑی خوفناک صورتِ حال ہے اس کا اعلان نہیں کیا جا رہا ۔ گویا انساں کی اپنی پیدا کردہ چیزیں ہی اس کی تباہی کا باعث بن جائیں گی۔ تادمِ تحریر اِن تمام آفات کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں اور لوگوں کی سمجھ میں یہ باتیں بھی آنا شروع ہو گئی ہیں کہ یہ جو ہائیڈروجن بم بنائے جا رہے ہیں اور اُن کے تجربات کئے جا رہے ہیں یہ سب کچھ انسانی فروغ وارتقا کا باعث نہیں ہو گا بلکہ انسانی تہذیب وترقی اور انسانی زندگی تک کے لئے تباہی وبربادی کا باعث ہو گا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ جو دانشور حضرات انسانی زندگی کے لئے ایسے خطرات سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہیں، انہیں آگے لایا جائے تاکہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ اِن آفات کی نشاندھی کر سکیں جو بہت جلد انسانی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لینے والی ہیں اور یہ کام صرف دانشور ہی کر سکتے ہیں کیونکہ یہ کام سیاست دانوں کے بس کی بات نہیں ہے ان کے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے پاس دوررس نظریں ہوتی ہیں، وہ تو صرف تھوڑے فاصلے تک دیکھ سکتے ہیں اور وہ فاصلہ ان کی ذاتی کامیابی کی حد تک ہی ہوتا ہے لیکن ایک مفکر کی سوچ اور اس کا فکری تناظر بہت وسیع ہوتا ہے وہ پوری دنیا کو سامنے رکھ کر سوچتا ہے اور پھر اپنی سوچ کا رشتہ عوام کی سوچ سے منسلک کرتا ہے اس کے بعد عوام کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ اپنے ووٹ کے ذریعے ایسے لوگوں کو منتخب کریں جن کی حکومت

اگر یہ کہے کہ ہمارے ملک کے پاس اتنے ہائیڈروجن بم ہیں جنہیں ہم تباہ کرتے ہیں اور آئندہ بم نہ بنانے کا وعدہ کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں سچ کی بالیدگی کے لیے ہمیں دنیا میں منزہ (genuinised) سوشلزم کو رائج کرنا ہوگا۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا انسانوں کی اکثریت کے بھوک اور بیماری کے ناسوروں کا کوئی علاج نہیں ہوگا۔ اب تک جتنی بھی تعلیمات انسان کے حصے میں آئی ہیں ابتدائے زمانہ سے آج تک انسانی ذہن نے جتنی بھی ارتقائی منازل مختلف اوقات میں طے کی ہیں اور شعور و ادراک کی روشنی جن جن ذرائع سے بھی حاصل ہوئی ہے آئندہ نسلوں کی رہنمائی کے لیئے کافی ہیں۔ اگر ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر خلوص نیت سے کام کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں اس لیئے جس قسم کی حکومتوں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے جس دن ویسی حکومتیں عالم وجود میں آنا شروع ہو جائیں گی اسی دن سے یوٹوپیا کا سفر شروع ہو جائے گا کیونکہ دنیا میں اسلحہ پر اٹھنے والے اخراجات کھربوں تک پہنچتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک ٹینک بنانے پر سو کروڑ روپے خرچ اٹھتا ہے اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس قدر دولت آگ کے شعلوں کی نذر ہو رہی ہے اور وہ شعلے انسانی حیات کے لیے موت بن کر دہک رہے ہیں۔ اگر یہی سرمایہ پولیو کے مریضوں پر اور بھوکے ننگے لوگوں پر خرچ کیا جائے تو پھر وہ وقت آجائے گا جب آپ کی آرزوؤں اور امنگوں کے شہر اور بستیاں آباد ہو جائیں گی اور یہ دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے گی۔

سیّد نیّر علی دادا

محترم پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

جناب عالی! آپ ہمارے عہد کے مستند محقق، معتبر نقاد، فاضل تاریخ دان، ارفع شاعر اور منفرد ماہر تعلیم ہیں آپ کی انتظامی صلاحیتیں بھی قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں سچ تو یہ ہے کہ آپ اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں اور ہم سب اہم معاملے میں آپ کی طرف رجوع کرنا اپنے لیئے باعثِ افتخار بھی سمجھتے ہیں اور آپ کی رائے کو بجا طور پر ناگزیر بھی خیال کرتے ہیں۔ آپ نے جس بالغ نظری سے ادبیاتِ مشرق و مغرب کا مطالعہ کیا ہے اس لحاظ سے بھی میں بجا طور پر آپ سے اپنے سوال کے بلیغ جواب کی توقع رکھتا ہوں۔

غیاث چودھری

آپ نے جو سوال کیا ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ آپ نے یہ مقولہ پیش کیا ہے کہ سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں ہمیشہ کم ہوتی ہے ایسی بات نہیں ہے سچ کی عملداری جھوٹ کے مقابلے میں کم نہیں ہوتی یہ مقولہ نہیں بن سکتا کیونکہ سچ بہر حال جھوٹ سے اہم ہے لیکن سچ کے مقابلے میں جھوٹ کی عملداری اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب معاشرہ بگڑ چکا ہو میرا خیال یہ ہے کہ آپ نے یہی سوال کیا ہے اور آپ نے موجودہ معاشرے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہی ہے۔ اگر یہ صورت ہے تو پھر اصل میں بنیادی مسئلہ جو ہے وہ اس منافقت کا ہے جو ہم میں در آئی ہے۔ یہ منافقت پیدا ہوئی ہے اخلاقی اقدار کو چھوڑ دینے سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے کہ ہم نے اس تضاد کو جو معاشرے میں مغرب کی یلغار کے طور پر آیا تھا۔ اپنے ہاں ایک طرف تو ہم نے اسے قبول کر لیا دوسری طرف ہمارا یقین اپنی اقدار میں ہے، نتیجہ یہ ہے کہ زندگی میں ایک تضاد جنم لیتا ہے اور وہ تضاد یہ ہے کہ ہم علمبردار تو سچ کے ہیں اور دعوٰی بھی یہی کرتے ہیں کہ ہم سچے ہیں لیکن چونکہ ہماری عملی

زندگیوں سے مذہب خارج ہو گیا ہے اس لئے ہمارے ہاں منافقت در آئی ہے دوسری طرف آزاد خیالی کو اپنے ہاں رائج پاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ زندگی میں معاشرتی تضاد پیدا ہو گیا ہے ہم کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں اور یہ دو غلا پن زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے میں اسے منافقت کہوں گا یہ ایسی منافقت ہے جس میں آدمی جان بوجھ کر حقائق سے آنکھیں پھیر لیتا ہے اور حقائق کی وہ تعبیر پسند کرتا ہے جو اس کے مزاج اور اس کے حالات کے مطابق ہوتی ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے ظاہر اور باطن میں کیا فرق پیدا ہو گیا ہے اور یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس میں ہر حال میں معاشرہ غرق ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اعلیٰ اقدار کے ساتھ جوڑنے کی کوشش نہیں کرتا اسے صرف نعرہ بازی کے طور پر اختیار کرتا ہے اور زندگی کو محض بسر کرنے کی چیز سمجھتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہی تضاد ہمارے ادب میں بھی ظاہر ہوا ہے ۔ جو ہماری زندگی میں ہے ۔ یہ منافقت جس میں ہم بلند بانگ دعوے کرتے ہیں ۔ لیکن حقیقت کچھ اور رہتی ہے اور یہ شعرا جو بڑا احساس طبقہ ہے وہ اسے محسوس کرتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ کو شعرا کے ہاں ایسے افکار کثرت سے ملیں گے جہاں انسان اس تضاد میں گرفتار ہے اور ان شعرا میں عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ جب یہ احساس کر لیتے ہیں کہ وہ منافقت بھرے معاشرے میں رہ رہے ہیں ۔ تو وہ اپنی ذات کو معاشرے سے الگ قرار دے کر بات کرتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود ان کے اور معاشرے کے درمیان جو فاصلے ہوتے ہیں ان کی نشاندھی کرتا ہے!

ڈاکٹر وحید قریشی

محترم ڈاکٹر وزیر آغا صاحب

جناب عالی، آپ تخلیق، تنقید، تحقیق اور ادبی ادارت، چاروں سطحوں پہ انفرادی اور امتیازی مرتبے پر فائز ہیں۔ معاصر مفکرین نے آپ سے اتفاق کرتے ہوئے اور کہیں آپ سے اختلاف کرتے ہوئے آپ کو بجا طور پہ خراجِ تحسین پیش کرنا ضروری گردانا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ آپ اپنے مخصوص نکتۂ نظر اور وسیع و ہمہ جہت مطالعے کے باعث ایک الگ مکتبۂ فکر کے مالک تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس لیے میں آرزومند ہوں کہ آپ مجھے میرے سوال کے حوالے سے اپنی منفرد اور قیمتی رائے سے نوازیں۔

غیاث چودھری

آپ نے پوچھا ہے کہ آخر یہ کیا قصہ ہے کہ جسے دیکھو وہ سچ کا حامی اور جھوٹ کا مخالف ہے مگر پورے معاشرے میں جھوٹ کا بول بالا ہے۔ اگر سارے لوگ سچ کے حامی اور جھوٹ کے مخالف ہیں تو پھر جھوٹ کون بول رہا ہے؟

بات محض سچ جھوٹ کی نہیں معاملہ اس سے بھی زیادہ گمبھیر ہے مثلاً کون ہے جو ظلم، قتل، استحصال، قوانین کی خلاف ورزی اور منافقت کی حمایت کا اعلان کرے گا یا غاصب، شرابی، زناکار، رشوت خور یا سمگلر یا بلیک مارکیٹ کرنے والے کو اپنا پیر و بنا لے گا۔ معاشرے کے کسی بھی فرد سے بات کر کے دیکھیں وہ علی الاعلان ان سماج دشمنوں کی مذمت کرے گا، اور انہیں معاشرے کی پیشانی پر ایک دھبہ قرار دے گا، مگر اس سب کچھ کے باوجود معاشرہ ایسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے، حد یہ کہ وہی شخص جو خلوت میں آپ کو فرشتہ سیرت نظر آئے گا، جلوت میں انہیں باتوں کا مرتکب ہو گا، جن کی مذمت اس نے شخصی سطح پر کی تھی، میرے

ایک دوست بنولے کے تیل کا کاروبار کرتے تھے۔ انتہائی شریف با اخلاق اور خدا ترس انسان تھے۔ ایک روز باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ وہ تیل میں پانچ فی صد آمیزش (adultration) کرتے ہیں۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر ان سے پوچھا کہ قبلہ آپ بھی؟ Youtoo Brutas وہ خود بھی حیران ہو گئے کہنے لگے کہ میں نے اس بات پر کبھی یوں غور ہی نہیں کیا۔ سب کرتے ہیں سو میں بھی کرتا ہوں مگر آپ نے مجھے بیدار کر دیا ہے سو آئندہ کے لیئے توبہ!

مثل تو یہ ہے کہ:

ع چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

مگر حقیقی دنیا میں لوگ باگ خلوت میں تو ایک شریف، با اخلاق اور ذمہ دار شہری کی طرح تمام سماجی برائیوں پر لعنت بھیجتے ہیں لیکن جب گھر سے باہر آتے ہیں اور ایک بپھرے ہوئے جمِ غفیر کا حصہ بن جاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ان کی شخصیت کی باگ ڈور خود ان کے ہاتھوں سے نکل کر کسی طاغوتی قوت کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے بات دراصل یہ ہے کہ ہر شخص کے اندر ایک اور شخص رہتا ہے یہ دوسرا شخص اس کی شخصیّت کا اجتماعی روپ ہے اور بنی نوعِ انسان کے ہاں ایک "قدرِ مشترک" کے طور پر موجود ہے۔ انسان نے شخصی طور پہ تو بہت ترقی کی ہے۔ اور ایسے پیغمبر، اولیاء، تخلیق کار، محب وطن، اور اعلیٰ اخلاقیات کے حامل افراد پیدا کیئے ہیں جن پر فخر کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف سچ کو جھوٹ سے الگ کر کے دکھایا اور مثالی زندگیاں بسر کیں بلکہ بنی نوعِ انسان کے لیئے رشد و ہدایت کا سرچشمہ بھی ثابت ہوئے۔ دوسری طرف اجتماعی سطح پر انسان نے بہت کم ترقی کی ہے۔ وہ ابھی تک جنگوں، نسلی جھگڑوں، سماج دشمن سرگرمیوں، ایذا رسانی اور ایذا پسندی کے رویّوں نیز منافقت، جھوٹ اور ہر طرح کی غلاظت میں لتھڑا ہوا ہے۔ جنگل کے جانوروں کو وحشت اور بربریّت کا طعنہ دیا جاتا ہے مگر انسان نے اجتماعی طور پہ جس بربریت اور وحشت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی

مثال جانوروں میں شاید ہی ملے۔ اجتماعی طور پر انسان نے نہ صرف خونخواری کے عمل سے لذت کشید کی ہے بلکہ اجتماع کی طاغوتی قوت کے سامنے سر تسلیم خم بھی کیا ہے کیسیرنے نے اس متشدد قوت کو قدیم سمیر کے دیومالائی کردار تیامت سے تشبیہ دی تھی۔ اور ایرک فرڈک نے اسے ایک ایسی قوت قرار دیا جس کے سامنے انسان بلا چون وچرا اپنی شخصی آزادیوں سے دستبردار ہو کر انبوہ کا ایک بے نام اور بے چہرہ جزو بن جاتا ہے اس کا مظاہرہ روز جلوسوں اور جنگوں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جہاں فرد کی قوت فیصلہ مفلوج ہو جاتی ہے اور وہ اجتماع کی قوتِ فیصلہ کے تابع ہو، اگر وہ سب کچھ کرنا ہے جس کا وہ بحیثیت فرد تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ اجتماعی روپ بنیادی طور پر Animal ہے بھی اور متشدد بھی، اس کے اپنے قوانین اور جبلی میلانات جس پر مہذب انسان ابھی تک قابو نہیں پا سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخصی طور پر جس عمل کی مذمت کرتا ہے، جب خود اپنی شخصیت کے اجتماعی رُخ کی زد میں ہوتا ہے تو اسی کا مرتکب ہونے لگتا ہے یہ اجتماعی شخصیت محض بڑے بڑے اجتماعوں میں ہی فعّال نہیں ہوتی۔ بلکہ جہاں کہیں کوئی سماجی دائرہ یا تنظیم وجود میں آتی ہے تو یہ فعّال ہونے لگتی ہے۔ انسان کے ہاں دوسروں کی نقل اتارنے Minesis کا جو وصف خاص موجود ہے وہ اس اجتماعی روپ ہی کا شاخسانہ ہے جس کے تحت تمام انسان بھیڑوں کے ایک گلّے میں تبدیل ہو جاتے ہیں پھر جب کوئی اس گلّے سے بھٹکتا ہے یا بھٹکنے کی کوشش کرتا ہے تو انسان کا اجتماعی روپ اسے طنز، حکم یا چھڑی سے دوبارہ ''راہ راست'' پر لے آتا ہے۔ سچ انسان کی شخصی سطح کا ایک عمل ہے اور تمام بزرگ ہستیوں نے سچ کا نام بلند کیا ہے اور اس کے لئے زہر پینے، صلیب پر چڑھنے یا گردن کٹانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ دوسری طرف جھوٹ انسان کی اجتماعی سطح کا شاخسانہ ہے جسے اجتماع کی قوت نے اپنے مقاصد کے لئے بار بار استعمال کیا۔ لہٰذا جب ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص جھوٹ کی مذمت اور

یہ سچ کی تعریف کرتا ہے تو ہم جان لیتے ہیں کہ اس کے اندر کی شخصی سطح اپنا اظہار کر رہی ہے لیکن جب یہی شخص جھوٹ بولنے لگتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس شخص کی باگ ڈور اس کی ذات کے اجتماعی رخ کے ہاتھوں میں ہے۔ لہٰذا وہ اب اس امر سے آگاہ ہی نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے وہی بات کہ سب کرتے ہیں سو میں بھی کرتا ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ اجتماع کی اس سمندری بلا یعنی قیامت کو کس طرح پابہ زنجیر کیا جائے واضح رہے کہ یہ بلا اصلاً قوت کا سرچشمہ ہے۔ آپ اس بہت بڑے ذخیرہ آب کے بند کو توڑ کر معاشرے کو غرق بھی کر سکتے ہیں اور اس سے نہریں نکال کر ارضِ وطن کو سیراب کرنے میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں ابھی تک ہمارے معلمین اخلاق نے فرد کی شخصی سطح ہی کو سنوارنے کی کوشش کی ہے اور اسے اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دے کر سزا یا جزا سے نوازا ہے لیکن فرد کے اجتماعی رُخ کو سنوارنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے اگر ایسا ہونے لگے (اور بعض معاشروں نے کسی حد تک کیا بھی ہے) تو ایسی اعلیٰ روایات پیدا ہو سکتی ہیں جو انسان کے اجتماعی رُخ یعنی اس کی مادر پدر آزاد جبلت کو پابہ زنجیر کر سکتی ہیں۔ مثلاً قطار میں کھڑے ہونے کی روایت، وقت پر آنے کی عادت، عورتوں کی عزت کرنے کا رویّہ، معذور افراد کی خدمت کرنے کا عمل، جھوٹ نہ بولنے کا تہیّہ بالکل سامنے کی باتیں ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو ایسی پائیدار روایات نظر آنے لگیں گی جو ان سے زیادہ اہم روایات کو وجود میں لانے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

آپ بچے کو سچ بولنے کی ہدایت تو کر سکتے ہیں لیکن جب یہی بچہ ہر کسی کو جھوٹ بولتے ہوئے دیکھے تو وہ خود سچ پر کس طرح کاربند رہ سکتا ہے! ضرورت اس بات کی ہے کہ پورے معاشرے کو معاشرتی تنظیموں کے ذریعے اخلاق حسنہ کی تربیت دی جائے۔ تاکہ اعلیٰ اخلاقی روایات وجود میں آسکیں۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا فرد اپنی شخصی حیثیت میں بھلا مانس اور سچا لیکن اپنی اجتماعی حیثیت میں

بدمعاش اور جھوٹا ہمیشہ دکھائی دے گا۔ ہمارے مشرقی معاشروں میں تمام تر اخلاقیات اوپر سے نیچے کی طرف آتی رہی ہیں۔ چنانچہ جب بادشاہ یا حاکم یا لیڈر نے اعلیٰ اخلاقیات کا مظاہرہ کیا ہے تو وہ اجتماع کی سائیکی کی آواز بن کر پورے معاشرے کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اخلاقیات پودے کی طرح زمین سے اُگ کر اپنے چھتنار کو آسمان تک لے جائے یہ تبھی ممکن ہے کہ نچلی سطح پر اخلاقی روایات موجود ہوں جو پودے کی کانٹ چھانٹ کرکے اسے ایک خاص صورت عطا کرسکیں۔ بصورت دیگر وہ ایک جنگلی درخت ہی کا روپ دھارے گا۔ سچ ثقافتی سطح پر تراش خراش کا زائیدہ ہے اور جھوٹ وہ پودا ہے جسے جنگل بننے سے کسی نے روکا نہیں ہے۔ لہٰذا ایک دوہرے عمل کی ضرورت ناگزیر ہے یعنی اوپر والی سطح پر ہمارے قائدین اور حاکم ایسی اخلاقیات کے نمائندے بن کر سامنے آئیں اور نچلی سطح پر اعلیٰ روایات جنم لیں۔ صرف اسی صورت میں انسان کے اجتماعی رُخ کا مثبت پہلو سامنے آسکتا ہے وہ پہلو جو سچ کا نام لیوا اور جھوٹ کا ازلی دشمن ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

احمد ندیم قاسمی صاحب — ڈاکٹر اسرار احمد صاحب — ڈاکٹر انور سدید صاحب — بشریٰ رحمٰن صاحبہ
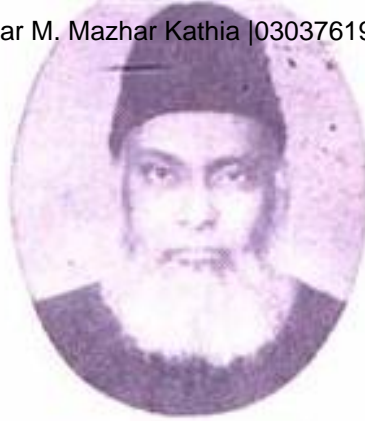
سید تنویر مرشد صاحب — پروفیسر جمیل ملک صاحب — پروفیسر جوگندر پال صاحب — پروفیسر جیلانی کامران صاحب

نعقد رمیز صاحب — ڈاکٹر طاہر القادری صاحب — ظہیر بابر صاحب — ظہیر کاشمیری صاحب

پروفیسر عارف عبدالمتین صاحب — میاں عبدالرشید صاحب — ڈاکٹر مبشر حسن صاحب — پروفیسر محمد منور صاحب

میرزا ادیب صاحب — سید نیر علی دادا صاحب — ڈاکٹر سید [illegible] صاحب — ڈاکٹر وزیر آغا صاحب